آج بھی ہو جو
براہیمؑ
کا ایماں پیدا
اخلاق حسین
اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

آج بھی ہو جو
ابراہیمؑ
کا ایماں پیدا

اخلاق حسین

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

قرآن مجید میں انبیائے سابقین میں سے جن اولوالعزم رُسُل کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، ان میں حضرت موسیٰ کے بعد سب سے زیادہ مفصّل حالات حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ملتے ہیں ۔ آپ کے بچپن، آپ کی جوانی، آپ کی دعوت، آپ کی آزمائش وقربانی اور آپ کی اولاد کے متعلق جابجا اور بار بار مجمل اور مفصّل واقعات سامنے آتے ہیں ۔ آپ کی زندگی کے پُرعزیمت ابواب کو بار بار اسوۂ حسنہ کے طور پر پیش کیا گیا اور اہل ایمان، اہل کتاب اور مشرکین عرب کو آپ کے اتّباع کی دعوت دی گئی ہے۔ قدم قدم پر اہل ایمان کو ابھارا گیا ہے کہ اسوۂ ابراہیمی کو اپنا کر مقامِ عزیمت اختیار کریں ۔

قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران میں سیرتِ ابراہیمؑ کے مختلف پہلو سامنے آتے رہے لیکن جب "معرکۂ فرعون وکلیمؑ" کی تالیف شروع کی تو آپ کی سیرت مبارکہ میں کچھ زیادہ ہی کشش نظر آئی اور اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ آج جب کہ اولادِ ابراہیمؑ چاروں طرف سے ابتلا و آزمائش سے دوچار ہے، اُس کے سامنے اس کے جدِّ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کی پُرعزیمت زندگی پیش کی جائے تاکہ وہ اپنا مقام اور مقصدِ زندگی پہچان کر ان آزمائشوں سے نبرد آزما ہو کر عہدہ برآ اور سرخرو ہو سکے ۔

اسی سلسلے میں سیرت ابراہیمی کی تلاش میں قرآن مجید کا خصوصی مطالعہ شروع کیا۔ جُوں جُوں مطالعہ وسیع ہوتا گیا، حضرت ابراہیمؑ سے تعلقِ خاطر بڑھتا گیا ۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ قرآن مجید کی جس آیت میں حضرت ابراہیم کا ذکر ملتا اسے یاد کرنے کی کوشش کرتا ۔ اس طرح محض اس شوق وجذبہ کی بدولت قرآن مجید کا اچھا خاصا حصہ یاد ہو گیا ۔!

ابھی اس وادیٔ شوق میں قدم رکھے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنوری ۱۹۷۱ء میں اللہ نے حج کی سعادت عطا فرمائی۔ حرم شریف پہنچ کر شعائرِ حرم کی محبت میں کچھ اور ہی اضافہ ہوا۔

مالکِ حرم کے جاہ وجلال، بیت الحرام کی عظمت وکشش، مقامِ ابراہیم کی کیفیت و فضیلت، دعائے خلیل کی اجابت ومقبولیت[1] اور منیٰ میں ارضِ ذبحِ عظیم کے مشاہدہ نے ایک نیا جذبہ عطا کیا۔ حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد محبتِ خلیل کو کچھ اور ہی نمو ملی، اور اب ایک ہی دھن اور ایک ہی مشغلہ تھا اور وہ تھا سیرت ابراہیمی کا مطالعہ۔ چن چن کر قرآن مجید کی وہ تمام آیات یاد کرنا شروع کر دیں۔ جہاں ابوالانبیا سیّدنا ابراہیم کا ذکر آیا ہے اور اُسی وقت یہ طے کر لیا کہ اس عظیم شخصیت کی، جسے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ایک رسول ونبی بلکہ ایک امت اور اپنا خلیل قرار دیا ہے، سیرت کو جلد از جلد جمع کر کے اس کے نام لیواؤں کے سامنے پیش کیا جائے، تاکہ وہ نہ صرف اپنی ذات، اپنی ملّت اور اپنے جدِّ اعلیٰ سے واقف ہوں، بلکہ ان کے سامنے ایک ایسا اعلیٰ اور ارفع نمونہ آجائے جو انھیں ہر وقت اور پیہم مقامِ فضیلت کے حصول کی جد وجہد کے لئے گرماتا رہے اور مشکل اوقات میں ان کے متزلزل قدموں کو ثبات و استقامت بخشتا رہے۔

اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو

لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند (اقبال)

میں نے کوشش کی ہے کہ اُس عظیم ہستی کے اوراقِ زندگی کو اس مختصر کتاب میں بند کر دوں۔ جہاں تک ہو سکا ہے اس کو ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ ایک مسلسل

---

[1] رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرۃ - ۱۲۶)

"اے ربّ، اس سرزمین کو پُرامن بنا اور اُس کے رہنے والوں میں سے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائیں، اس کو پھلوں کے رزق سے نواز"

داستان کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اپنی پچھلی تالیف "معرکۂ فرعون و کلیم" کی طرح ایک
ایک واقعہ کے متعلق جتنی بھی آیات مل سکی ہیں، ان سب کو یکجا کر دیا ہے اور اس بابرکت ہستی
سے متعلق واقعات کو ایک تاریخِ گزشتہ کے بجائے ایک اسوہ کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔
کوشش کی گئی ہے کہ یہ ساری داستان صرف قرآنی مطالب کے بیان تک محدود رہے کہیں
کہیں پر احادیث سے مدد لی گئی ہے۔ تاریخی کتب اور تورات و انجیل کے بیان کردہ واقعات
سے قصداً احتراز کیا گیا ہے۔ کہ نہ صرف ان کی صحت مشکوک ہے بلکہ وہ اُس مقصد و جذبہ
سے بھی عاری ہیں جن سے قرآن مجید کی ہر آیت مملو ہے۔

یہ حقیر کوشش صرف اس لئے کی گئی ہے کہ قارئین اس میں دلوں کی حرارت، جذبۂ
قربانی کی فراوانی اور ایمان کی تابناکی پا سکیں اور اپنی عظمتِ گم گشتہ کو پھر سے حاصل کرنے کی
جہدِ مسلسل میں مصروف ہو جائیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ○

اخلاق حسین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

ابراہیم علیہ السلام کے ملک اور قوم کی حالت

خاندانی حالات

ابراہیم علیہ السلام عراق کے شہر " اُر " کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو نہ صرف شرک و بت پرستی میں ڈوبا ہوا تھا بلکہ اس کو مشرکین کی سربراہی بھی حاصل تھی۔ ان کا والد آزر نہ صرف بُت پرست تھا بلکہ بت پرستوں کا سردار اور رہنت بھی تھا۔ ان کے والد کی اس حیثیت کو قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِهَةً ۚ
اِنِّىۡۤ اَرٰٮكَ وَقَوۡمَكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۝ (الانعام: ۷۴)

" اور ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تو نے بتوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ بیشک میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں "

ان کی قوم ہر طرح کے شرک، شاہ پرستی، کواکب پرستی اور خصوصاً بُت پرستی میں پوری طرح غرق تھی۔ اس قوم کو اپنی بُت پرستی کا نہ صرف اقرار تھا بلکہ وہ اس پر فخر بھی کرتی تھی۔ اُس قوم نے بڑے فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ

قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيۡنَ ۝ (الشعراء: ۷۱)

" انھوں نے (یعنی ابراہیمؑ کی قوم نے) کہا کہ ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور اس پر جمے رہیں گے۔ "

اس شرک زدہ ماحول میں جہاں قدم قدم پر اصنام پرستی اور کواکب پرستی کی ظلمتیں ڈیرے ڈالے ہوئے تھیں، رحمتِ حق کو جوش آیا اور اپنے بندوں کو کفر و شرک کے اندھیروں سے نکالنے

کے لئے ایک بُت پرست گھرانے میں آزر کے یہاں ابراہیم کو پیدا کیا۔ گو ابراہیمؑ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جس کی رگ رگ میں شرک رچا بسا ہوا تھا، لیکن اللہ نے ان کو ابتداء ہی سے ایسی فطرتِ سلیم عطا فرمائی تھی کہ وہ ہر قسم کے شرک سے بیزار تھے اور یہ فطرتِ سلیم انھیں کیوں نہ عطا کی جاتی جب کہ انھیں دنیا کا امام اور پیشوا موحدین بنانا تھا۔ یوں بھی یہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ جن حضرات کو نبوت عطا کرتا ہے، ان کی یومِ پیدائش سے لے کر یومِ وفات تک نگرانی و حفاظت کرتا ہے۔

چنانچہ موسیٰؑ کو نبوت عطا کرنے سے پہلے، ان کی پیدائش سے لے کر دربارِ فرعون میں آمد تک ہر لمحہ نگرانی و حفاظت فرمائی۔ یوسفؑ کو نبوت سے پہلے ہی بچپن سے لے کر عنفوانِ شباب تک قدم قدم پر حفاظت فرماتے ہوئے تختِ مصر پر بٹھا دیا۔ بھائیوں کا حسد اور ارادۂ قتل، بیگمات کی تحریص و ترغیب کوئی بھی چیز نہ ان کا راستہ روک سکی اور نہ اُن کے قدم پھسلا سکی۔ نبیٔ اکرم صلّی اللہ وسلّم کی بچپن ہی سے ایسی نگہداشت فرمائی کہ آپ کبھی بت پرستی کی طرف مائل ہی نہیں ہوئے۔

قرآن مجید میں یہ تو کہیں نہیں ملتا کہ انھیں نبوت کب عطا ہوئی۔ البتہ ایک اشارہ ضرور ایسا ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شباب دعوت میں نوجوانی کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے۔ جب انھوں نے صنم کدۂ بابل میں بتوں کو پاش پاش کیا تو ان کی قوم نے اُن پر شبہ کرتے ہوئے کہا:

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗ اِبْرٰهِيْمُ (انبیاء: ۶۰)

"اور انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک لڑکے کو جس کو ابراہیم کہا جاتا ہے، ان کے متعلق ذکر کرتے سنا ہے۔"

فتی ایسے لڑکے کو کہتے ہیں جو ہوش مند ہو یا نوجوان ہو۔ ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے قبل ان کو نبوت مل چکی تھی، اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ آپ ابتداءِ شباب ہی میں نبوت سے سرفراز ہو چکے تھے۔

عطائے علم یقین

حضرت ابراہیمؑ کے گردوپیش میں جس طرح کفر و شرک چھایا ہوا تھا اور جس طرح اقتدارِ وقت (نمرود) اور عوام شرک میں مبتلا تھے، ایسے ماحول میں کلمۂ حق کہنا اور اللہ کی وحدانیت کا اعلان کرنا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ اگر داعیٔ حق کو اپنی دعوت کی حقانیت پر کامل یقین نہ ہو اور وہ اپنے خالق و مالک کے کارخانۂ قدرت کا عینی مشاہدہ نہ کر چکا ہو، تو اتنے بڑے اقدام کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ تو داللہ کی سنت بھی یہی رہی ہے کہ جب وہ اپنے کسی بندے کو مقامِ نبوت پر سرفراز فرماتا ہے اور اس کو کسی بڑی مہم پر روانہ کرتا ہے تو اپنے اس نبی کو علمِ یقین عطا فرماتا ہے۔

چنانچہ جب موسیٰؑ کو فرعون کے دربار کی جانب روانہ کیا تو دولتِ یقین سے مالا مال کرنے کے لیے شرفِ ہم کلامی سے نوازا، آیاتِ بینات عصائے کلیمی، یدِ بیضا، حجابِ نہیں اور وادیٔ ایمن میں اپنی تجلیاتِ انوار کا مشاہدہ کرایا۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مدینہ طیبہ کو ہجرت کرنے اور ایک نئی اسلامی حکومت کو قائم کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی ساتھ مشاہدۂ معراج بھی عطا فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو مہم درپیش تھی وہ بھی نہایت عظیم الشان تھی۔ انھیں اپنی پوری قوم سے لڑنا تھا۔ دنیا کے عظیم بت خانے میں اذانِ حق دینا تھی، اقتدارِ وقت نمرود سے پنجہ آزمائی کرنا تھی۔ اگر اس نازک موقع پر انھیں عین الیقین حاصل نہ ہوتا، تو ان آزمائشوں میں کیسے ثابت قدم رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اسی علم الیقین اور عین الیقین کو حاصل کرنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے التجا کی۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ط

"اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب مجھے دکھا تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا"

ربِ عظیم نے فرمایا:

قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط

"کہا کیا تو ایمان نہیں رکھتا۔"

ابراہیمؑ نے عرض کیا:

قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ

"اُس نے کہا کیوں نہیں، لیکن میں اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہوں"

کیسا پیارا انداز ہے گزارش کا۔ یہ نہیں کہا کہ مجھے شک ہے یا اس پر ایمان نہیں رکھتا، یا میں جب مانوں گا جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ نہیں، بلکہ عرض کیا کہ اس مشن پر چلنے اور دوسروں کو بلانے کے لئے دل کو جس اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے، وہ درکار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور ارشاد فرمایا:

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (البقرۃ: ۲۶۰)

"فرمایا اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔"

ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا اور اپنی آنکھوں سے بعث بعد الموت کو دیکھ لیا۔ اب وہ اس علم الیقین سے سرشار تھے جو کارِ نبوت کے لئے درکار ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا اگر اتنا ہی کام ہوتا کہ وہ خود ایمان لائیں اور اس کا اعلان کر دیں تو شاید اس مشاہدۃ العین کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن انھیں تو نہ صرف اپنے ایمان کا اعلان کرنا ہوتا ہے بلکہ مشکل ترین، نہایت ناساعد اور خطرات سے پُر ماحول میں ہر موافق و مخالف کو دعوت دینا ہوتی ہے اور پورے عزم و یقین سے کہنا ہوتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ کوئی سنی سنائی بات نہیں، آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی درخواست کو قبول کیا اور انھیں علم یقین عطا فرمایا۔ اس ہی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ

مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ (الانعام : ۷۵)

"اور اس طرح ہم نے ابراہیم کو زمین و آسمان کا نظامِ سلطنت دکھایا، تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے ۔"

یہ یقین ہی وہ دولت ہے جو ایک انسان کو ثابت قدمی اور استقامت عطا کرتا ہے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتے ہیں لیکن صاحبِ یقین کے قدموں میں لغزش نہیں آتی ۔ دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت آجائے لیکن اس کے عزم و ثبات کے سامنے ہیچ ہوتی ہے ۔ اسی کیفیت کو حکیم الامت علاّمہ اقبال رحؒ نے کیا خوب ادا کیا ہے ع:

جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

آغازِ کشمکش

کواکب پرستی پر پہلی ضرب

اس مشاہدہ کائنات اور کارسازئ حق پر کامل یقین نے ایک نیا عزم اور ایک تازہ ولولہ عطا کیا۔ باطل سے یکہ وتنہا ٹکرانے کے لئے جس جرأت و قوت کی ضرورت تھی، وہ حاصل ہوگئی تھی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم عؑ نے فیصلہ کیا کہ اس کفر و شرک کی ماری ہوئی قوم کو پوری قوت سے جھنجھوڑوں گا، اس کی گمراہی کی ایک ایک بنیاد کو ڈھاکر توحید کی صراط مستقیم دکھاؤں گا۔ اس مقصد کے لئے آپ نے سب سے پہلے ستارہ پرستی کو نشانہ بنایا۔

پہلی دلیل

چنانچہ ایک رات جب کہ آسمان پر ستارے پھیلے ہوئے تھے، اور اُن کی قوم جمع تھی انھوں نے موقع مناسب سمجھتے ہوئے قوم کو متوجہ کیا اور کہا:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ

"چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اُس نے ایک تارا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے"

قوم بڑی خوش ہوئی ہوگی کہ دیکھو بالآخر ہماری بات مان لی گئی اور ہمارا دین سچا ثابت ہوا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ یہ بات اس ہی پر پلٹ کر جا پڑے گی۔ اس کی یہ خوشی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوگی، اُسے معلوم نہ تھا کہ یہ اعلان، تھوڑی ہی دیر بعد اثباتِ توحید کے لئے دلیل بن جائے گا۔ اور اُن کا قلعۂ شرک زمین بوس ہو جائے گا۔ چنانچہ جب تھوڑی دیر بعد وہ ستارہ ڈوب گیا۔ تو ابراہیم عؑ نے ان کے عقائد مشرکانہ پر ایک کاری ضرب لگاتے ہوئے کہا:

فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ۝

"مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں"

اب تو قوم بڑی حیران ہوئی ہوگی کہ یہ کیا ہوگیا؟ وہ تو سمجھی تھی کہ ہمارا داؤ چل گیا۔ لیکن جب تھوڑی ہی دیر میں اس کے تار و پود بکھر گئے تو بڑی مایوسی ہوئی ہوگی،

یہ تو حضرت ابراہیمؑ کے ترکشِ دلائل کا پہلا تیر ہی تھا، ابھی تو قوم کو اس سے بھی بڑے صدمے برداشت کرنا تھے۔ ابراہیمؑ نے جب دیکھا کہ اس وقت لوہا گرم ہے تو انھوں نے دوسری چوٹ اُن کے اس سے بڑے "اِلٰہ" پر لگائی۔

دوسری دلیل

جب چاند نکلا تو انھوں نے کہا۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ج

"پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب"

قوم خوش ہوگئی کہ چلو چھوٹا خدا نہ مانا، بڑے کو مان لیا۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو بھولا نہیں۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ اس کے چھوٹے "رب" کا جو حشر ہوا تھا۔ وہی حشر اس بڑے رب کا ہوگا۔ چنانچہ جب چاند بھی ڈوب گیا —— اور اسے ڈوبنا ہی تھا —— تو انھوں نے اس کے تصورِ ربوبیت پر ایک اور شدید ضرب لگائی، اور اعلان کیا۔

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝

"مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو —— میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا ہوتا۔"

پہلے موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے "رب" کا ذکر نہیں کیا تھا، شاید وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ قوم اس ضرب کو برداشت کرتی ہے یا نہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ اس کو سہہ گئے تو انھوں نے بڑھ کر دوسری ضرب لگائی جو پہلی سے زیادہ شدید تھی۔ اس ایک ہی بات سے انھوں نے کئی مقاصد حاصل کیے۔

۞ پہلی بات تو یہ ثابت کی کہ جس طرح تمہارا چھوٹا "رب" ناکارہ تھا، اُسی طرح تمہارا یہ بڑا رب بھی ناکارہ ثابت ہوا ہے۔

• دوسری بات یہ ثابت کی کہ میرا رب اور ہے اور قوم کا "رب" کوئی اور ہے۔ میرے رب کی صفات اس کے رب سے مختلف ہیں۔ میرے رب کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور جو اسے چھوڑ دے وہ اندھیرے ہی میں بھٹکتا پھرتا ہے۔

• تیسری بات یہ ثابت کی کہ یہ قوم جو چاند ستاروں کو معبود بنائے بیٹھی ہے، وہ صریحاً گمراہ ہے۔ وہ ایسے معبودوں کے پیچھے چل رہی ہے جن کو خود کوئی ثبات نہیں۔ جو خود ہی اندھیروں میں گم ہو جائے وہ کسی دوسرے کو کیا راہ دکھائے گا۔

قوم شاید اس وار پر تلملا اٹھی ہوگی اور عین ممکن تھا کہ وہ بپھر جاتی اور اپنے معبودوں کی اس تذلیل پر انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتی، لیکن ابراہیم نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ اور ایک تیسری ضرب لگائی، جو شاہ ضرب تھی۔ اس ضرب نے ان کے مشرکانہ عقاید و اوہام کے قلعوں کو پوری طرح منہدم کر دیا۔ وہ ضرب کیا تھی؟ اس کو قرآن ہی کے الفاظ میں سنیئے۔

تیسری دلیل

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ

"پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے"

قوم نے سُکھ کا سانس لیا ہوگا کہ چلو چھوٹے خداؤں کو نہیں مانتا نہ مانے، اس بڑے خدا کو تو مانتا ہے۔ یہی غنیمت ہے، بالکل ہی منکر تو نہیں۔

لیکن اس کا یہ اطمینان بھی جلد ہی غائب ہو گیا۔ ان کا جب یہ بڑا خدا بھی غروب ہو گیا تو ابراہیم ؑ نے نہ صرف یہ کہ قوم کے مشرکانہ عقائد کی قلعی کھول دی۔ اور اُن سے بیزاری کا برملا اظہار کیا بلکہ اپنی دعوت کا نہایت دلنشین اور مدلل انداز میں تعارف کرایا اور واضح طور پر راہِ ہدایت بھی دکھا دی۔

یہ "بڑا خدا" سورج جب ڈوب گیا تو پھر ابراہیم ؑ نے کہا۔

فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

"مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو ابراہیم پکار اُٹھا، اے برادرانِ قوم! میں اُن

سب سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ "

یہاں ابراہیم علیہ السلام نے صرف یہ نہیں کہا کہ میں اس کو نہیں مانتا، بلکہ فرمایا کہ

" میں ان سب سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔" یہی وہ مقامِ عزیمت ہے جو ابراہیمؑ کا طرۂ امتیاز تھا۔ ایک ایسے مُنکَر کو نہ ماننا جسے ساری قوم مانتی ہو، یہ بھی بڑا کام تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اس انکار کو اپنے دل میں لیے بیٹھے رہتے۔ لیکن ابراہیمؑ کے مقام سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ ایک منکر کو دیکھیں اور اسے صرف نہ مان کر بیٹھے رہیں۔ انھیں تو ایک عالَم کو راہ دکھانا تھی، حقیقت کو واضح کرنا تھا اور سارے ہی منکرات کو مٹانا تھا۔ انھیں تو ان کے اوہامِ باطلہ پر نہ صرف ضرب لگانا تھی۔ بلکہ کفر و شرک کے قلعوں کو ڈھانا تھا۔ انھیں نہ صرف منکَر کا انکار کرنا تھا بلکہ اپنے عقیدہ کا دانشگاف الفاظ میں اعلان کرنا تھا اور اُس منکر سے بیزاری کا اعلان بھی کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا:

" میں ان سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو "

یہاں پر نہ صرف اپنے عقیدہ کا اعلان فرمایا بلکہ قوم کی گمراہی کی بھی نشان دہی کر دی کہ تم سب لوگ شرک میں مبتلا ہو اور خدائے واحد کے ساتھ یہ جھوٹے اور بناوٹی خدا گھڑ رکھے ہیں۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہ منفی طریقے پر اپنے طریقہ کا اعلان فرما دیتے۔ آپ نے دیکھا کہ اب موقع مناسب ہے کہ میں اثباتی طریقہ پر بھی اپنی دعوت پیش کر دوں، چنانچہ آپ نے اپنی دعوت اور اپنا موقف یوں بیان فرمایا۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (الانعام: ۷۹)

" میں نے اپنا رُخ یکسو ہو کر اس ذات کی طرف موڑ لیا ہے جس نے زمین و آسمانوں کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں "

اس ایک جملے میں آپ نے کئی حقیقتیں نہایت مدلّل اور دل نشین انداز میں پیش کیں۔

○ ایک یہ کہ اس زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہی اس بات کے لائق ہے کہ

اس سے رجوع کیا جائے اور اُس ہی کا ہو رہا جائے

- دوسرے یہ کہ یہ تمہارے خدا ــــ ستارے، چاند اور سورج ــــ خالقِ ارض و سما نہیں۔ بلکہ وہ صرف وہ خدا ہے جسے میں مانتا ہوں۔
- تیسرے یہ کہ میں اس عقیدے میں مذبذب یا مصلحت کوش نہیں، میں نے یکسو ہو کر اس خدا کا دامن تھاما ہے اور میرے دل میں اُس کے سوا کوئی اور نہیں بستا ہے۔
- چوتھے یہ کہ مشرک ایک علیحدہ قوم ہیں اور میں ایک دوسری ہی قوم ہوں۔ میں نہ صرف تمہارے عقاید سے بیزار ہوں بلکہ عملاً تم سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا ہوں۔

ابراہیمؑ نے جس مُدلّل طریقے اور دو ٹوک انداز میں اپنی دعوت، اپنا موقف اور اپنا مقام واضح کیا، اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ قوم ان کی بات مان لیتی، مگر باپ دادا کی اندھی تقلید، تعصب اور جہالت ایسی چیزیں ہیں جو کسی واضح سے واضح حقیقت کو دیکھنے نہیں دیتیں اور انسان کی سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں سلب کر لیتی ہیں؛ چنانچہ ان کی قوم نے بھی وہی رویہ اختیار کیا جو ایک اندھی مقلد، ہٹ دھرم اور متعصب قوم کرتی ہے۔ اُسے نہ ماننا تھا اور نہ مانی۔ گو وہ حضرت ابراہیمؑ کے دلائل کا تو کوئی جواب نہ دے سکتی تھی لیکن اُس ہٹ دھرمی سے اُسے کون روک سکتا تھا جس میں وہ مبتلا تھی۔ افسوس، وہ اپنی روش سے باز نہ آئی اور کفر و شرک کے اندھیروں میں یوں ہی بھٹکتی رہی۔

قوم کی جھگڑالو ذہنیت

ان کی قوم کی اس ہی ہٹ دھرمی، کٹ حجتی اور جھگڑالو ذہنیت کا مندرجہ ذیل آیات میں ذکر کیا گیا ہے،

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ۚ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۭ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ رَبِّيْ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (الانعام: ۸۰)

"اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اُس نے کہا کیا تم اللہ کے بارے میں

مجھ سے جھگڑتے ہو۔ حالانکہ اس ہی نے مجھے ہدایت دی ہے اور میں
اُن سے نہیں ڈرتا جنھیں تم اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہو۔ مجھے وہ کوئی
نقصان نہیں پہنچا سکتے، اِلّا یہ کہ میرا رب ہی مجھے کچھ نقصان پہنچانا چاہے اور
میرے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ تو کیا تم اب بھی ہوش میں نہ آؤ گے؟"

یہاں ابراہیمؑ نے اپنی قوم کی کج بحثی اور مشرکانہ عقائد پر سخت گرفت کی۔ قوم نے جب دیکھا کہ ابراہیمؑ نے اس کے تین بڑے بڑے خداؤں کو، ایک ایک کر کے سب کو رد کر دیا ہے، تو وہ تمام مشرکوں کی طرح ان کو اُن "گستاخیوں" پر ڈرانے لگی جو اس کے خیال میں ابراہیم نے کی تھیں۔ کہنے لگی، دیکھو تم نے ان خداؤں کو ناراض کر دیا ہے۔ اب تم پر اس "گستاخی" کی مار پڑے گی۔ اور تم جلد ہی اس کا مزہ چکھ لو گے۔ ممکن ہے کہ بیماریوں سے ڈرایا ہو، یا رزق کے چھیننے کا اندیشہ دلایا ہو یا جسمانی سزا کا خوف دلایا ہو۔ اگر ابراہیمؑ کا ایمان ذرا بھی کمزور ہوتا تو وہ اِن دھمکیوں سے مرعوب ہو جاتے۔ لیکن جس دل میں خدائے واحد کا خوف سما گیا ہو اس میں معبودانِ باطل کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔ انھوں نے اس کی تمام دھمکیوں کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے نہایت مدلّل انداز میں اس کی گمراہیوں کو واضح کیا اور اپنی دعوت کو بھی پیش کیا۔ فرمایا:

"کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے ہدایت دی ہے"

یہ کہہ کر انھوں نے قوم کی دُکھتی رگ کو چھیڑا۔ وہ قوم لاکھ مشرکانہ افعال میں مبتلا ہو، لیکن ایک ربّ الارباب کے تصور سے خالی نہ تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کہ ان خداؤں کے اوپر ایک بڑا خدا ضرور ہے جو سب پر غالب ہے۔ چنانچہ جب آپ نے یہ کہا کہ اُس خدا کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو۔ جس نے مجھے ہدایت دی ہے۔ تو وہ اسے جھٹلا نہ سکے۔ اس ہی ایک فقرے میں انھوں نے اپنی دعوت کی بنیاد بھی بنا دی کہ میں یہ باتیں کچھ اپنے جی سے گھڑ گھڑ کر نہیں بتا رہا ہوں بلکہ یہ تو وہ ہدایت ہے جس سے میرے رب نے مجھے نوازا ہے، اور ہدایت دینے والا تو صرف اللہ ہی ہے، رہے تمہارے معبود تو ان کے پاس گمراہی ہی گمراہی ہے۔

پھر نہایت جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ میں تمہارے بے بنیاد ڈراووں اور دھمکیوں سے بالکل نہیں ڈرتا۔ اگر میرے رب ہی کو منظور ہوا تو مجھے کچھ نقصان پہونچ سکتا ہے ورنہ تم سب اور تمہارے سارے معبود مل کر زور لگالیں، مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اور میرا رب ایسا بھی نہیں ہے کہ اُسے یہ پتا نہ ہو کہ اس کے بندوں پر کیا گزر رہی ہے۔ ہر چیز اس کے احاطۂ علم میں ہے۔ وہ اپنے بندوں کی ضرور مدد کرے گا۔ اگر تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے تو نہ سمجھو۔ رہی اُن ڈراووں اور دھمکیوں کی حقیقت جو تم مجھے دے رہے ہو۔ تو میں تمہیں بتاتا ہوں:

دعوتِ توحید

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (الانعام: ۸۱)

"اور میں ان سے کیسے ڈروں جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔ جب کہ تم اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہوئے نہیں ڈرتے۔ جس کے لئے اس نے تمہیں کوئی سند نہیں دی۔ پس اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو بتاؤ کہ کونسا فریق مامون رہنے کا زیادہ حقدار ہے"

یعنی جب تم سلطانِ کائنات کے ساتھ شرک کرتے ہوئے نہیں ڈرتے، جب کہ تمہارے پاس اس کے لئے نہ کوئی سند ہے اور نہ دلیل اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کی توہین کر رہے ہو، حالانکہ وہ چاہے تو وہ ہر وقت تمہیں جیسی چاہے سزا دے سکتا ہے، تو پھر میں ان جھوٹے خداؤں سے کیا ڈروں جن کے پاس سرے سے کوئی زور ہے ہی نہیں۔ اب بتاؤ کہ تم محفوظ و مامون ہو کہ ہر وقت خدائی گرفت میں ہو یا میں، جس کے مقابلہ میں یہ بے جان سیّارے ہیں جو خود ہی مجبور و بے کس ایک لگے بندھے راستے پر چلنے کے پابند ہیں۔ آؤ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ حقیقی امن کن لوگوں کو نصیب ہوگا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ

الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (الانعام : ۸۲)

"جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمانوں کو ظلم سے آلودہ نہ کیا، وہی لوگ امن پائیں گے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔"

سب سے بڑا ظلم تو یہ شرک ہے جو خدا کے فرمان کے خلاف، خدا کی مخلوق کو خدا ہی کا شریک ٹھہراتا ہے۔ جو لوگ اس ظلم کو اپنا وطیرہ بنالیں وہ کیسے محفوظ و مامون رہ سکتے ہیں۔ حقیقی امن —— روح اور جسم دونوں کا امن —— اُن ہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ پر ایمان لائیں اور اُسے ہر قسم کے شرک کی آلودگیوں سے بچائے رکھیں۔ دراصل یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں، نہ کہ وہ لوگ جو خود بھی بھٹکے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی بھٹکاتے ہیں۔

ابراہیمؑ کی یہ گفتگو اتنی بدلل اور اتنی برحق تھی کہ اُن کی قوم سے جواب نہ بن پڑا۔ اُسے یہ تو توفیق حاصل نہ ہوئی کہ وہ ان دلائل سے توحید کا راستہ اختیار کرتی، البتہ اپنی شکست پر دانت پیستی رہ گئی ہوگی۔ یہ دلائل دراصل اُس منبعِ علم و حکمت کا فیضان تھے جو ہر وقت اپنے بندوں پر اپنی نوازشوں کی بارش کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ (الانعام: ۸۳)

"اور یہ ہماری حجت تھی جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر عطا کی تھی ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں بے شک تیرا رب بڑا ہی حکیم و علیم ہے۔"

تبلیغِ عام

قوم پر یہ کھلی ہوئی فتح، اب ابراہیمؑ کے بہت سے اگلے اقدامات کا سبب بنی اور انھیں اپنی دعوت پھیلانے کے لئے ایک نیا میدان ہاتھ آگیا۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے اگلی ضرب اس کی اصنام پرستی پر لگائی۔

تردیدِ اصنام پرستی ——— دوسری ضرب

اس تبلیغِ عام کی تفصیل قرآن مجید میں یوں ملتی ہے

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝

(الشعراء: ۶۹۔۷۰)

"اور انھیں ابراہیم کا قصہ سناؤ جب کہ اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو"

دعوت کا پہلا میدان

ایک صاحبِ دعوت کا پہلا اور فطری میدان اس کا اپنا گھر، اپنا خاندان، اپنا معاشرہ اور اپنا ملک ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں وہ پلا بڑھا ہوتا ہے، جن لوگوں سے اس کے روابط و تعلقات ہوتے ہیں، جن سے وہ مانوس ہوتا ہے؛ جن میں وہ خود پہلے سے متعارف ہوتا ہے، وہی اس کے زیادہ حقدار ہوتے ہیں کہ ان کو ان نعمتوں سے مالا مال کرے جن سے وہ خود مستفید ہو رہا ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں یہ لوگ اُس کی بات سننے کے لیے زیادہ مستعد اور موزوں ہو سکتے ہیں۔ وہ ان کی زبان اور طور طریقوں سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ اس لیے ان ہی کی زبان میں جسے وہ سمجھ سکیں، اپنی بات اچھی طرح بیان کر سکتا ہے۔ وہ ان کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس لیے انھیں نفسیاتی طور پر بہتر طریقے سے سمجھا سکتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید میں یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ط (ابراہیم: ۴)

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہ اس ہی قوم کی زبان بولتا ہو، تاکہ وہ ان کے سامنے کھول کر بیان کر سکے"

دوسری جگہ اسے یوں بیان فرمایا

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ○

(یوسف: ۱۰۹)

"اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجے وہ سب اُن ہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے، ہم جن کی طرف وحی بھیجتے رہے ہیں۔"

یہی وہ دعوتی ترتیب ہے جس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو حکم دیا۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ○ (الشعراء: ۲۱۴)

"اور اپنے قریبی کنبہ والوں کو ڈراؤ۔"

بڑے ہی نادان ہیں وہ لوگ اور بڑے ہی ناآشنا ہیں ترتیبِ دعوت سے وہ لوگ، جو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے اور جوشِ تبلیغ میں اپنی قوم، اپنی بستیوں، اور اپنے ملک کو کفر وفسق کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ کر دیس بدیس، دُور دراز علاقوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم ؑ چونکہ نبی تھے اور ترتیبِ دعوت سے بخوبی واقف، اس لیے انھوں نے سب سے پہلے اپنے گھر، اپنے والد اور اپنی قوم کے سامنے اپنی دعوت پیش کی اور اپنے والد اور اپنی قوم سے پوچھا کہ "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو؟"

قوم کو دعوتِ توحید

یہ فقرہ کوئی سوال نہ تھا کہ جس کو حل کرنے کے لیے حضرت ابراہیم ؑ نے قوم کے سامنے پیش کیا ہو، یا وہ اُن بتوں سے ناواقف نہ تھے جو ان سے دریافت کر رہے تھے بھلا وہ شخص جو بتوں کے گرو کے گھر میں پیدا ہوا ہو، جس کے اِرد گرد بت خانے ہی بت خانے موجود ہوں، وہ بتوں سے کیسے ناواقف رہ سکتا تھا۔ یہ تو دعوت پیش کرنے کا ایک موثر طریقہ تھا۔ یہ تو مخاطب کو پوری طرح متوجہ کرنے کا اسلوب تھا، ورنہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ لکڑی اور پتھر کی گھڑی ہوئی مورتیاں ہیں۔ سورۃ انبیا آیت ۵۲ سے یہ بات

خود ہی ثابت ہو جاتی ہے۔

قوم بھی خوب سمجھتی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کیا پوچھ رہے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ سوال کسی اضافۂ علم یا واقفیتِ حال کے لیئے نہیں کیا جا رہا ہے۔ اُس نے سوال کا جواب بڑی تعلّی اور بڑے فخر کے ساتھ دیا۔ بولی،

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۝ (الشعرآء:۷۱)

"بولے یہ کچھ بُت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور اسی پر ہم جمے رہیں گے"

اس جواب میں قوم نے اپنی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور اپنا فیصلہ بھی سنا دیا کہ ہم کچھ کچے لوگ نہیں کہ باتوں میں آکر اپنے دین و مذہب کو چھوڑ دیں، یہ چاہے صحیح ہو یا غلط، رہیں گے اسی راہ پہ جمے ہوئے۔ واقعی ہٹ دھرمی، ضد، کج بحثی، تعصب اور اندھی تقلید ایسی ہی چیزیں ہیں جو انسان کی آنکھیں بند کر دیتی ہیں، کان بہرے کر دیتی ہیں اور عقل ماؤف کر دیتی ہیں اور حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیتی ہیں۔

ابراہیمؑ نے جب دیکھا کہ اب قوم توجہ سے سننے کی حالت میں ہے۔ تو انھوں نے فوراً ایک چبھتا ہوا سوال کیا جو عقل و دانش کو اپیل کرنے والا بھی تھا اور جس میں معبودؔ کی صفات بھی واضح طور پر بیان کی گئی تھیں، فرمایا

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۝ (الشعرآء:۷۲-۷۳)

"اُس نے پوچھا "کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انھیں پکارتے ہو؟ یا تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں"

یہاں آپ سوال کی کاٹ بھی دیکھئے اور اس کا تیکھا پن بھی۔ اس کے اندر پوشیدہ دلائل بھی دیکھیئے اور برآمد ہونے والے نتائج بھی۔ اندازِ تفہیم دیکھیئے اور اثرات بھی۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ عبادت کے لائق تو ایسی ذات ہے کہ جو اپنے بندوں کی بھی سنے اور سرگوشیاں بھی۔ جو خوش ہو تو نفع پہونچائے اور ناراض ہو تو نقصان بھی پہنچا سکے۔ کیا تمہارے بت ان صفات سے متصف ہیں؟ کیا واقعی یہ تمہاری پکار کا جواب دیتے ہیں؟

کیا واقعی ان میں یہ قدرت ہے کہ کسی کو نفع و نقصان پہنچا سکیں۔

ظاہر ہے کہ قوم اس کا اثبات میں جواب کیسے دے سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ اگر ہٹ دھرمی سے "ہاں" کہا تو ابھی اس کی قلعی کھل جائے گی۔ اگر ابھی اس نے انھیں پکا رلیا اور انھوں نے جواب نہ دیا —— اور وہ جواب دے بھی نہ سکتے تھے —— تو سب کرکری ہو جائے گی۔ اس لیے اُس نے ایسا جواب دیا جو صورتِ واقعہ کے مطابق بھی تھا اور ان کے عزم بالجزم کو ظاہر کرتا تھا۔ بولے!

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ (الشعراء: ۷۴)

"بولے، نہیں، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا"

اسے کہتے ہیں "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ"، سوال دیگر جواب دیگر۔ سوال کیا جاتا ہے کہ ان کی خصوصیات بتاؤ۔ جواب دیتے ہیں کہ میاں ان باتوں کو چھوڑو، ان میں کیا دھرا ہے۔ ہمارے تو باپ دادا سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ کل کے لڑکے ہو ہمیں بتانے چلے ہو۔ سینکڑوں برس سے ہمارے باپ دادا ایسا کرتے چلے آئے ہیں تو کیا تم اُن سے بھی زیادہ عقل مند اور تجربہ کار ہو۔

واقعی جب عقل جواب دینے سے عاجز آجاتی ہے اور آدمی ہٹ دھرمی پر اُتر آتا ہے تو آپ اسے کیسے دل نشین دلائل کیوں نہ دیں وہ "نہ مانوں" ہی کی رٹ لگاتا رہے گا۔ عقل سے عاری، ہٹ دھرم اور کج بحثوں کا یہی انداز ہوتا ہے۔ اور اُن کے پاس ایک ہی دلیل ہوتی ہے کہ "ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ ہے" جن کی بیئے کی پھوٹ گئی ہوں انھیں دن کی روشنی کون دکھائے۔

ابراہیمؑ نے جب دیکھا کہ قوم لاجواب ہوگئی ہے اور اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں رہی ہے تو انھوں نے ربِّ حقیقی کی وحدانیت اور صفات پر ایسے مسکت اور دل نشین دلائل دیئے کہ اگر ان کے دل میں قبولِ حق کا شائبہ بھی ہوتا تو ان کی بات مان لیتے فرمایا:۔

صفاتِ ربّ العالمین

قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۝ وَالَّذِیْۤ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۝

(الشعراء: ۷۵-۸۲)

"اُس (ابراہیم) نے کہا "کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بندگی بجالاتے رہے؟ میرے تو یہ سب دشمن ہیں، بجز ایک رب العالمین کے، جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرمائے گا"

ابراہیمؑ کے اس جواب میں ذات باری کی صفات کا بھرپور تعارف اور دعوت کی حقانیت پر دل نشین استدلال بھی ہے۔ اظہار واقعہ بھی ہے اور حکمت تبلیغ بھی، ان کی اور ان کے باپ دادا کی گمراہی کی لطیف انداز میں نشان دہی بھی ہے اور راہ حق کی طرف پوری رہنمائی بھی۔

آپ نے سب سے پہلے اُس گمراہی کی نشان دہی کی جس میں ان کی قوم اور اُس کے آبار واجداد مبتلا تھے۔ آپ نے نہایت چونکا دینے والے انداز میں اُن کو اُن کی حالت پر متوجہ کیا اور فرمایا "کبھی تم نے آنکھیں کھول کر اُن چیزوں کو دیکھا بھی جن کی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بندگی بجالاتے رہے؟"

انھیں اپنے حال پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی۔ کیا معبود کی یہی نشان ہوتی

ہے کہ لوگ اپنے ہاتھوں سے گھڑ گھڑ کر اس کو سجا کر رکھیں یا معبود ہونے کے لائق
وہ ذات ہے جس کو کسی نے پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ خود تخلیق کرتا ہے اور دوسروں کو وجود
بخشتا ہے۔ ذرا غور تو کرو کہ معبود بننے کا کون حق دار ہے؟ کیا ان کی بندگی کی جائے
جو خود اپنے وجود کے لئے دوسروں کی صناعی کے محتاج ہیں یا وہ جو ہر آن ایک نئی تخلیق
کررہا ہے اور زندگی کو نمو بخش رہا ہے۔

پھر آپ نے ان کے معبودانِ باطل سے اپنے تعلق کو واضح کیا اور فرمایا:

"میرے تو سب دشمن ہیں بجز ایک ربّ العالمین کے۔"

یعنی تم میرے اور اپنے معبودوں کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا، میں نہ
تو ان کا نیاز مند ہوں اور نہ گرویدہ۔ اس کے برعکس وہ سب میرے دشمن ہیں اور میں ان کا دشمن
ہوں۔ جہاں میں ہوں گا وہاں یہ بناوٹی خدا نہ ہوں گے۔ جہاں ان کی جھوٹی خدائی کے
ڈنکے بج رہے ہوں گے وہاں میرا رہنا ممکن نہ ہوگا۔ میں اپنے جیتے جی ان کی خدائی کو قبول
نہ کرسکوں گا۔ یہیں اپنے اور ان کے معبود کے فرق کو بھی واضح کردیا۔ کہا، تمہارا معبود تو اپنے
وجود اور بقا کے لیے تمہاری حفاظت کا محتاج ہے۔ اس کے برعکس میرا معبود نہ صرف یہ
کہ کسی کا محتاج نہیں۔ بلکہ تمام جہانوں کا اور ان جہانوں کے اندر جو کچھ ہے ان سب کا
خالق ہے، ان کی پرورش کررہا ہے اور یکہ و تنہا ان سب کی حفاظت کررہا ہے۔

اب انھوں نے رب العالمین کی تشریح پیش کی کہ اس سے ان کی کیا مراد ہے؟
اور یہ کہ اُس رب العالمین کی کیا صفات ہیں جن کی بنا پر وہ بندگی بجا لائے ہیں۔ بولے،

سب جہانوں کا رب

اس کی پہلی صفت تو یہ ہے کہ وہ "ربّ العالمین" ہے۔ کسی ایک خاص قوم،
کسی ایک ملک، کسی ایک نسل، کسی ایک طبقے یا کسی عقیدہ کے ماننے والوں کا ربّ نہیں۔
بلکہ کالے گورے، سرخ، سفید، مشرقی و مغربی، فرماں بردار و نافرمان، اطاعت کیش اور
باغی ہر ایک کا رب ہے۔ ہر ایک کی پرورش کرتا ہے، ہر ایک کی حفاظت فرماتا ہے اور
ہر ایک کو رزق دیتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کے اعمال و عقاید کیا ہیں۔

پھر صرف یہی نہیں کہ وہ تمام انسانوں کا رب ہے۔ بلکہ زمین و آسمان اور اُن کے اندر جتنی بھی چیزیں ہیں خواہ جاندار ہوں یا بے جان، مادہ ہو یا روح، جمادات ہوں یا نباتات، ثابت ہوں یا سیارے ان سب کی پرورش، حفاظت، ترقی و نمو کے لئے جتنی ضروریات بھی ہیں ان سب کا بندوبست بھی کرتا ہے اور کفالت بھی کرتا ہے۔ یہ تو ہیں اُس کی وہ عام صفات جو اس کی مخلوق کے ساتھ اس کے عام تعلق کو ظاہر کرتی ہیں۔

اب اس کی وہ صفات بھی سن لو۔ جن کو میں سوچ سمجھ کر مانتا ہوں۔ گو ان صفات کا پرتو ہر شے پر پڑ رہا ہے اور اس کا فیضان ہر پہر، ہر آن اور ہر لمحہ جاری ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کا اپنی ذات کے ساتھ خصوصی تعلق اس لیے ظاہر کیا کہ وہ اپنے ایمانِ رب العالمین کی وضاحت کر رہے تھے۔ نیز یہ بھی ممکن تھا کہ اگر اس وقت مخاطبین کے ساتھ تعلق ظاہر کیا جاتا تو وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر انکار کر دیتے کہ ہم تو ایسا نہیں مانتے اور دلیل اثر کرنے کی بجائے الٹا ان کی نفرت و مزاحمت میں اضافہ کر دیتی۔

ہادی و رہنما

انھوں نے فرمایا "جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے" یعنی اُس رب العالمین نے، مجھے صرف پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا کہ میں اندھیروں میں بھٹکتا پھروں، جو خدا اپنی ہر مخلوق کی ہر ضرورت کا انتظام فرماتا ہے، اُس سے یہ بات بعید ہے کہ میری ہدایت و رہنمائی کا بندوبست نہ فرماتا، چنانچہ اس نے نہ صرف یہ کہ مجھے زندگی بخشی بلکہ مجھے ہدایت و رہنمائی بھی عطا فرمائی۔

اس ہی جملے سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ دعوت جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں، یہ میں نے کوئی اپنے جی سے نہیں گھڑلی ہے، یہ تو وہ ہدایت عام ہے جو اس کی ربوبیت کی مظہر ہے اور ہر خاص و عام کے لیے اس کا انعام ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ ضلالت و گمراہی ہے۔ دوسری جگہ آپ کی اس گفتگو کو مختصراً یوں بیان فرمایا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ۝ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً

عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (الزخرف: ۲۶-۲۸)

"اور یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم جس کی بندگی کرتے ہو میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق صرف اُس سے اُس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ وہی میری رہنمائی کرے گا" اور ابراہیم یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا، تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔"

مصالح کے علی الرغم تبلیغِ حق

یہاں حضرت ابراہیمؑ نے قوم کی خواہشات اور عقاید کے علی الرغم کمال جراُتِ ایمانی کے ساتھ حق کو پیش کیا اور اس کے ساتھ اس حق کے لیے دلیل بھی پیش کردی۔ دعوت میں کبھی ایسا مقام آتا ہے جب تمام مصلحتوں، مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود حق کو اس کی ٹھیٹھ شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ چاہے اُس سے کوئی خوش ہو یا ناخوش۔ یہ ایک ایسا نازک مرحلہ تھا کہ اگر اس وقت حضرت ابراہیمؑ احقاقِ حق میں ذرا بھی کسر چھوڑ دیتے۔ یا مخاطبین کی ذہنیت کے پیشِ نظر ذرا سی بھی مداہنت برت جاتے تو قیامت تک کے لیے باطل سے مصالحت کرنے کی ایک نظیر قائم ہو جاتی۔ ممکن ہے کہ ایسے نازک موقع پر ایک عام داعی اپنے مخاطبین کے دل جیتنے کے لئے کچھ رعایت کر جاتا۔ لیکن جس شخصیت کو اللہ تعالیٰ "لِلنَّاسِ اِمَامًا" بنانے والا تھا اور جو اس کی براہِ راست نگرانی میں کام کر رہا تھا وہ کیسے کوتاہی کر سکتا تھا۔ چنانچہ آپ نے ڈنکے کی چوٹ پر، نہایت دھڑلے سے اپنا موقف بیان کیا اور فرمایا، میرا تمہارے معبودوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ اس جراُتِ ایمانی کا اللہ تعالیٰ نے یہ صلہ دیا کہ آج بھی، چار ہزار سال گزرنے کے باوجود دعوتِ ابراہیمی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ باقی ہے اور آیندہ بھی رہے گی۔

رازق

پھر فرمایا۔

"جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے"

اس مختصر جملے میں حقیقتِ حال کا اظہار بھی ہے اور دھمکیوں کا جواب بھی۔ یعنی رزق کے خزانے کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں۔ جس خدا نے پیدا کیا ہے۔ اُس ہی نے یہ ذمہ داری لے رکھی ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو رزق بھی عطا کرے گا۔ پیدا کرنے کے بعد وہ مخلوق سے بے تعلق ہو کر نہیں بیٹھ گیا۔ ہر آن اُس کی حفاظت و نگرانی بھی کرتا ہے اور ان کی ضروریات کو پورا بھی کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ زعم باطل ہے کہ مجھ سے ناراض ہو کر میرے رزق کے دروازے بند کر دے گا تو وہ کان کھول کر سن لے کہ رزق کا انتظام تو خاص طور پر رب العالمین نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ اگر یہ انتظامِ رزق جباروں اور برسرِ اقتدار لوگوں کے قبضہ میں ہوتا، تو خدا کی یہ زمین کبھی کی اجڑ گئی ہوتی۔ اور صرف اتنی ہی بات نہیں تکلیف و راحت کے بھی سب سر رشتے اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر میں بیمار پڑوں گا تو کوئی نہیں ہے جو مجھے اُس تکلیف سے نجات دلا سکے، وہی ذات مجھے شفا بخشے گی اور میری ہر تکلیف کا مداوا کرے گی۔ اب اگر کسی کو اپنا شوقِ ستم رانی پورا کرنا ہے تو کرلے۔ میرے پاس تو ایسا شافیٔ مطلق ہے، جو میری ہر تکلیف کا مداوا کرے گا، ہر رنج سے مجھے نجات دے گا اور میرے تمام دکھوں کا علاج کرے گا۔

اور بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی کہ اُس نے پیدا کیا اور ہدایت دے دی۔ پھر کھانے پینے کا بندوبست کیا اور تکلیفوں سے بچا دیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے انجامِ کار کا اختیار بھی اُس نے اپنے ہی پاس رکھا ہے، اور اس کے لیے جو تکلیفیں اٹھاؤں گا، اس کا اجر بھی اس ہی کے ذمہ ہے۔

مارنے اور جِلانے والا

"جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا"

یعنی اس زندگی کو انجام تک پہنچانے کا بھی اُس ہی نے ذمہ لے رکھا ہے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اُس کی مرضی کے بغیر مجھے مار سکے۔ وہ جب تک چاہے گا میں زندہ رہوں گا اور جب اس کی مرضی ہوگی مجھے اُٹھا لے گا۔ جس طرح زندگی کا انجام اس کے ہاتھ میں ہے

اسی طرح زندگی کے تمام معاملات کو انجامِ کار تک پہونچانا بھی اس ہی کی ذمہ داری ہے ۔ اُسے جو کام مجھ سے لینا ہے وہ لے کر رہے گا اور کوئی طاقت ایسی نہیں جو مجھے اُس سے روک سکے اور پھر یہ دنیا کی زندگی ساری زندگی نہیں۔ اُس نے ایک دوسرا عالم بنا رکھا ہے۔ جہاں وہ میری تمام خدمات کا صلہ دے گا۔ ہر ایک سے اس کے کئے کا سوال کیا جائے گا اور اُس کے مطابق اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ اگر معاملہ صرف اتنا ہی ہوتا کہ موت کی ہچکیوں کے ساتھ سارے کام ختم ہو جائیں گے تو شاید آدمی اُس زندگی کو بچانے کی فکر کرتا ـــــــ حالانکہ یہ بھی اُس کے اختیار میں نہیں ـــــــ لیکن ایسا نہیں۔ وہ دنیا کے جھمیلوں اور مصروفیات کا خاتمہ ایک خاص مقررہ وقت پر کرے گا جس کو موت کہتے ہیں اور پھر ایک دن سب کو دوبارہ زندہ کرے گا اور ہر ایک سے اس کے کاموں کا حساب لے گا کسی کو چھوڑے گا نہیں۔ پھر جس نے اطاعت و فرماں برداری کی ہوگی اس کو جزا دے گا اور جس نے نافرمانی و سرکشی کی ہوگی اُس کو سزا دے گا اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ساتھ اچھا ہی معاملہ کرے گا۔

یومِ آخرت میں بخشنے والا

"اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرمائے گا"

یہاں حضرت ابراہیم ؑ نے روزِ جزا کی ضرورت، اس کی اہمیت اور اس کے یقینی ہونے پر دلیل بھی دیدی اور اپنے عزمِ راسخ کا اظہار بھی کر دیا کہ بالفرض محال اگر تم نے مجھے یہاں اس دعوت کے پیش کرنے اور خدا کی بندگی کرنے سے روک بھی دیا تو روک کر دیکھ لو ـــــــ حالانکہ تمہیں اس کی قدرت حاصل نہیں ـــــــ مجھے یقین کامل ہے کہ میری قربانیاں، میری اطاعت گزاری اور میری فرماں برداری رائگاں نہ جائے گی اور ایک دن مجھے ان سب کا پورا پورا صلہ ملے گا۔ مجھے اپنے ربِ کریم پر پورا پورا بھروسہ ہے کہ اس کام کے کرنے میں مجھ سے اگر غلطی ہو بھی گئی تو وہ اُن سے صرف نظر کر کے مجھے اپنے انعام سے نوازے گا۔

جس کے پاس یہ یقین اور یہ بنیاد ہو اس کو دنیا کی کوئی طاقت اپنی جگہ سے ہلا سکتی ہے؟ ابراہیم ؑ نے قوم کو سمجھانے کے لئے جتنی دلیلیں دیں وہ سب اپنی جگہ نہایت محکم اور واضح تھیں۔ لیکن جسے کچھ سمجھنا ہی نہ ہو اور جس نے پہلے سے طے کر لیا ہو کہ مجھے مان کر نہیں

دینا ہے، اس پر بڑی سے بڑی دلیل کارگر نہیں ہو سکتی۔ اگر قوم کو ماننا ہوتا تو توحید باری تعالیٰ اور ترک شرک کے لئے ابراہیمؑ کی یہ گفتگو کافی تھی، مگر بُرا ہو اس اندھی تقلید آبا کا کہ وہ حق سے حق بات کو بھی ماننے نہیں دیتی۔

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

جُہدِ مُسلسل

اگر ابراہیمؑ کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو تھک ہار کر بیٹھ جاتا اور اس کٹ حجّت قوم کو اس کے انجام تک پہونچنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ مگر وہ تو ایک نبی تھے، وہ ایک داعیٔ حق تھے، ان کی تو زندگی کا مشن ہی یہی تھا کہ گمراہوں کو صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کریں، یہاں تک کہ یا تو خود اس راہ میں فنا ہو جائیں یا قوم کو صحیح راہ پر لگا دیں۔ بیشک ہر داعیٔ حق کا عموماً اور انبیاء علیہم السلام کا خصوصاً یہی مقام ہوتا ہے۔

قوم کا یہ مایوس کن اور ہمت شکن رویّہ دیکھ کر ابراہیمؑ نچلے نہ بیٹھ گئے۔ وہ ہر وقت اس ہی دھن میں لگے ہوئے تھے اور ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے جب وہ قوم کو اس کی گمراہی پر متنبہ کر سکیں اور راہِ راست کی دعوت دے سکیں۔ جو بندہ یا بندہ؛ چنانچہ انھیں جلد ہی ایک ایسا نادر موقع ہاتھ آگیا جب وہ اپنی قوم کو بھرپور طریقے سے سمجھا سکیں۔ جلد اس لیے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت حضرت ابراہیمؑ نوجوان تھے۔ (ملاحظہ ہو سورۂ انبیاء آیت ۶۰)

ہوا یوں کہ ایک مرتبہ جب کہ کوئی قومی میلہ یا تہوار تھا، ان کے اہلِ خاندان اور قوم کے دوسرے افراد، جو شاید ان کے ملنے جُلنے والے یا شناسا ہوں، ان کے پاس آئے اور اپنے ساتھ لے چلنے کے لیے کوشش کرنے لگے۔ ان کا خیال ہوگا کہ اس طرح ساتھ رہنے سہنے سے شاید ابراہیمؑ کے خیالات میں کچھ تبدیلی آجائے اور وہ ہمارے رنگ میں رنگ جائیں یا کم از کم اپنی دعوت اور تبلیغ میں اتنے سرگرم نہ رہیں اور ہمیں کچھ سکون میسر آجائے۔ آخر تھے تو وہ اس ہی قوم کے ایک ہونہار نوجوان۔ اس وقت ابراہیمؑ جس مقام پر فائز تھے اس کی تفصیل قرآن مجید نے یوں بیان کی ہے:

حاملینِ نبوت کے اوصاف

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝

"اور اس (نوح ؑ) کے ہی طریقے پر چلنے والا ابراہیم تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم لے کر آیا" (الصّٰفّٰت ۸۳-۸۴)

نوح علیہ السلام کے بعد گو بے شمار انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے لیکن ایک عظیم الشان عالم گیر دعوت لے کر اٹھنے والی شخصیت حضرت ابراہیم ؑ ہی کی تھی۔ اس لئے نوح ؑ کے بعد ان کا ذکر خاص طور پر کیا گیا۔ جس وقت آپ کو نبوت پر سرفراز کیا گیا، اس وقت آپ قوم کے ایسے صالح نوجوان تھے جس کا دل ہر قسم کی آلائشوں سے پاک و صاف تھا۔ آپ تمام پاکیزہ صفات سے آراستہ و پیراستہ تھے اور نہایت سمجھ دار تھے۔ آپ کی اس خوبی کی گواہی خود ذات پاک نے یوں دی ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝

(انبیاء: ۵۱)

"اور اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم ؑ کو اُس کی ہوش مندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے ہیں۔"

یعنی ابراہیم ؑ کو یہ نبوت یوں ہی اَلل ٹپ نہیں دے دی گئی تھی۔ اس کی پاکیزہ سیرت، اس کی اہلیت و قابلیت سے ہم بخوبی واقف تھے اور اس کی یہ قابلیت و ذہانت بھی تو آخر ہم ہی نے دی تھی، اور یہ منصب ہے بھی اللہ تعالیٰ ہی کا کہ وہ ایک شخص کی صلاحیتوں سے پوری طرح واقف ہو، کیونکہ صلاحیتیں دینے والا وہ خود ہی تو ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ (الانعام: ۱۲۴)

"اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کے سپرد کرے"

معمولی سے حکمراں جب کسی کو اپنا سفیر و نمائندہ بنا کر بھیجتے ہیں تو متعلقہ فرد کی خوب اچھی طرح چھان پھٹک کر کے پروانۂ تقرری دیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے متعلق، جو رب العالمین ہے، الملک القدوس ہے، کیا گمان ہے؟ کیا اُسے معلوم نہیں کہ اس بارِ گراں کو کون اٹھا سکتا

ہے۔ اور کون نہیں؟ پھر کیا اُس بار کو اٹھانے اور اس کا بہترین طور پر حق ادا کرنے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، اُن سے اپنے رسول و پیغام بر کو محروم رکھے گا؟ اور اللہ تعالیٰ نے جس منصب رفیع کے لئے حضرت ابراہیمؑ کا انتخاب کیا تھا، آئندہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہی اس کے لئے موزوں ترین شخص تھے۔

دعوت کا ایجابی پہلو

ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سامنے جو دعوت پیش کی تھی وہ مختصراً قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

(العنکبوت: ۱۶-۱۸)

"اور ابراہیم کو بھیجا، جب کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا: "اللہ کی بندگی کرو اور اُس سے ڈرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پوج رہے ہو۔ وہ تو محض بت ہیں، اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو، وہ تمہیں کوئی بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اُسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اُسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ اور اگر تم جھٹلاتے ہو، تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں۔"

انبیاء علیہم السلام کی بنیادی دعوت

یہ اُس ہی دعوت کا اعادہ ہے جو ابتدا میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی تھی۔ اور سورہ انعام (آیات ۸۰ - ۸۴) میں بیان کی جا چکی ہے۔ گو پیرایۂ بیان قدرے مختلف ہے۔ لیکن مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔

صرف اللہ کی بندگی کرو

تمام انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کے سامنے جو دعوت پیش کی ہے۔ اس کی ابتداء اس ہی بات سے ہوتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہی ہے، بندگی اس کی کرو اور اس ہی سے ڈرو۔ مثلاً۔

مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف: ۶۵)

"اللہ کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں"

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ (الشعراء: ۱۰۸)

"اللہ سے ڈرو۔ اور میری اطاعت کرو"

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (ھود: ۲)

"اللہ کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو۔"

دعوت کی یہی یکسانیت ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے بھی سب سے پہلے اپنی قوم کو یہی پیغام دیا کہ۔

"اللہ کی بندگی کرو اور اُس سے ڈرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانو"

یہ جملہ جہاں ابراہیمؑ کی دعوت کی بنیاد بتاتا ہے وہیں شرک کی جڑیں بھی کاٹ دیتا ہے۔ پہلے ہی فقرہ میں آپ نے بتا دیا کہ یہ بناوٹی خدا جو تم نے گھڑ رکھے ہیں۔ اس بات کے ہرگز مستحق نہیں کہ ان کی بندگی و غلامی کی جائے، یہ تو صرف اللہ واحد ہی کی ذات ہے، کہ آدمی اس کی بے چون و چرا اطاعت کرے، اس کے احکام کی تعمیل کرے، اس کی رضا تلاش کرے اور اس کی ناراضی سے بچے۔ جب اختیارات سارے کے سارے اللہ ہی کے ہیں۔ تو پھر اللہ ہی اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ ساری دنیا مل کر اگر کسی کو کوئی نقصان

پہنچانا چاہے یا سزا دینا چاہے تو نہیں دے سکتی اگر اللہ نہیں چاہتا۔ لیکن اللہ جب اپنے نافرمانوں کو سزا دینا چاہے تو کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا اس کے آڑے آسکے۔ اس لئے بندگی، غلامی، عبادت، اطاعت اور فرماں برداری کے لائق صرف خدائے واحد کی ذات ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو سلامتی اسی میں ہے کہ اس احکم الحاکمین کے سامنے سر نیاز جھکا دو، اپنی پیشانی کو اس کے سامنے رگڑو، اپنے معاملات اس کے سپرد کرو اور اس کی رضا میں راضی رہو۔

اس کے بعد آپ نے ان کے اوہامِ باطلہ اور غلط نظریات کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

اللہ کے سوا سب معبود باطل ہیں

"تم اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پوج رہے ہو وہ تو محض بُت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔" یعنی یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے ایسی چیزوں کو اپنا معبود بنائے جو اپنے وجود کے لئے اپنے ہی بندوں کا رہین منت ہے۔ اگر انسان خود اپنے ہاتھوں سے ایک مورتی گھڑے اور پھر کہے یہ مجھے رزق دیتی ہے۔ زندگی عطا کرتی ہے، مرادیں پوری کرتی ہے اور میری جان و مال کی حفاظت کرتی ہے۔ جو خود ہی بے بس ہے وہ دوسروں کی دستگیری کیا کرے گا۔

ان جھوٹے خداؤں کی بے بسی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے"

اس دنیا کی زندگی میں انسان دو ہی خطروں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ایک رزق کا خطرہ، دوسرا جان کا خطرہ۔

رزق صرف اللہ سے مانگو

رزق حاصل کرنے کے لئے انسان بڑے بڑے پاپڑ بیلتا ہے۔ دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کرتا ہے، جان جوکھوں کے کام اختیار کرتا ہے، بڑی بڑی تکلیفیں اٹھاتا ہے اور یہ

سب کس لئے کہ اُسے رزق ملنے کی آس ہوتی ہے۔ جہاں سے اُسے رزق کی مار پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے وہیں ناک رگڑ کر، ہاتھ جوڑ کر، بندۂ بے دام بن کر حاضر ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس ہی خطرہ سے پردہ اُٹھا کر بتایا کہ تم جنھیں رازق سمجھ بیٹھے ہو وہ تو خود اپنے لئے رزق حاصل نہیں کر سکتے۔ تمہیں کہاں سے رزق دیں گے۔ ارے، تمہیں اگر رزق حاصل کرنا ہے تو نادانو، اس کے در پہ جاؤ جس کے قبضے میں رزق کے تمام خزانے ہیں۔

"اللہ سے رزق مانگو اور اُس کی بندگی کرو۔ اور اُس کا شکر ادا کرو، اُسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو"

جب رزق مانگنا ٹھہرا تو اس سے مانگا جائے جو فی الواقع رزق دے سکے۔ جب اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ تو رزق دینا بھی اس ہی کی ذمہ داری ہے۔ اس لئے اس ہی سے رزق طلب کرو۔ اس رزق ملنے کا شکرانہ یہ ہے کہ اس منعمِ حقیقی کی بندگی اور اطاعت کی جائے اور زبان سے بھی اس کا اعتراف کیا جائے۔ یہ تو نری حماقت ہوگی کہ اس سے رزق بھی لو اور اُس کی اطاعت بھی نہ کرو اور گن کسی اور کے گاؤ۔ جس نے تمہیں اپنی نعمتوں سے نوازا ہے، وہی سزاوارِ حمد بھی ہے۔ اور اگر تم اس کی حمد نہ بھی کرو تو اس کا نتیجہ خود دیکھ لوگے، کیونکہ تمہیں اس کی جناب میں بہرحال پیش ہونا ہے، تو کل جب تم نمک حراموں کی طرح پیش ہو تو یہ بہتر ہے، یا اس کے ثناخوانوں کی حیثیت سے جاؤ، یہ بہتر ہے۔

رسولوں کی ذمہ داری ——————— صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے

اللہ کی وحدانیت، اس کی الوہیت اور اس کی ربوبیت پر ایسے حسین اور دل نشین دلائل دینے کے بعد آپ نے کفرانِ نعمت کے نتائج سے بھی آگاہ کر دیا۔ فرمایا:

"اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر صاف صاف پیغام پہونچانے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں۔"

یعنی میرا کام یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں زبردستی اس راہ پر لے جاؤں جس پر تم چلنا نہ چاہو۔ اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے میرا فرض صرف اتنا ہے کہ تمہیں صحیح اور غلط راستوں سے آگاہ کر دوں، دونوں کے انجام سے تمہیں باخبر کر دوں اور بہتر سے بہتر انداز میں تمہیں سمجھانے کی کوشش

کروں ۔ اب اس کو ماننا یا نہ ماننا تمہارا اپنا کام ہے۔ مجھ پر اس کی کوئی نہ ذمہ داری نہیں ۔ ہر شخص کو اپنے کاموں کا آپ جواب دینا ہوگا۔

دعوت کا سلبی پہلو

ایجابی اور اثباتی طور پر اپنی دعوت پیش کرنے کے بعد آپ نے اس کا سلبی پہلو بھی بیان کیا، تاکہ بات ان کے دل میں پوری طرح اتر جائے اور ان کے لئے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ چنانچہ فرمایا:

بُت پرستی کی تردید

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ○ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ ○ (الصّٰفّٰت: ۸۵-۸۶)

"جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا۔ "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو۔"

دوسری جگہ اس سوال کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ○ (الانبیاء: ۵۲)

"یاد کرو وہ موقع جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ "یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو"

ابراہیمؑ اپنے خدا کے بارے میں پہلے ہی وضاحت کر چکے تھے کہ اس کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ اس لیے اس کی بندگی و اطاعت کرنی چاہیے۔ یہ سوال کر کے انھوں نے بات قوم پر ڈال دی۔ اب اس کا بار ثبوت قوم کے ذمہ تھا کہ وہ یہ ثابت کرے کہ الوہیت و ربوبیت کی جو شرائط ہیں، وہ اُن کے اِن گھڑے ہوئے خداؤں میں پائی جاتی ہیں، اور یہ سوال خاص طور پر اس لیے بھی کیا کہ قوم پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ ہم ان بتوں سے چمٹے رہیں گے۔

(الشعراء: ۷۱)

ان کے خداؤں کی حقیقت اور حیثیت بیان کرنے کے بعد اب حضرت ابراہیمؑ نے

موقع مناسب سمجھتے ہوئے ان کے ضمیر کو ایک مرتبہ پھر جھنجھوڑا اور خدائے حقیقی کی طرف انھیں پھر متوجہ کیا۔ فرمایا۔

فَمَا ظَنُّكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ○ (الصّٰفّٰت: ۸۷)

"آخر اللہ رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

یہاں سارا جھگڑا تو "ربّ العالمین" ہی کے بارے میں تھا۔ اگر وہ مان لیتے کہ ان کے بتوں کے علاوہ کوئی اور ہی رب العالمین ہے۔ تو ان کے پاس رہ ہی کیا جاتا، بات ختم ہو جاتی۔ یہی بات وہ ماننے کے لئے تیار نہ تھے، کیونکہ اگر وہ یہ بات مان لیتے تو ان کے سارے ٹھاٹ باٹھ، مندروں کے نذرانے، عوام میں مذہبی اجارہ داری اور چودھراہٹ کی بلند و بالا عمارت سب نیچے آرہتی۔ سوچتے ہوں گے کہ کیا جواب دیں، لیکن ظاہر ہے کہ قوم کے پاس اس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ بالآخر اُسے یہی کہنے بن پڑی:

گمراہ بزرگوں کی پیروی ہدایت نہیں

قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ○ (الانبیاء: ۵۳)

"انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے"

یہ ایسی بودی دلیل تھی کہ اس مدلل گفتگو کا جواب ہو ہی نہ سکتی تھی جو ابھی حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی۔ چنانچہ اب بات پوری طرح ان کی گرفت میں تھی، اور انھوں نے فوراً پلٹ کر کہا۔

قَالَ لَقَدْ كُنتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (الانبیاء: ۵۴)

"اُس نے کہا تم بھی گمراہ ہو اور تمھارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے"

یہ وقت تھا کہ قوم کو آئینہ دکھا دیا جائے کہ وہ کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے بے کم و کاست قوم کو اس کا چہرہ دکھایا کہ یہ ہے وہ "رُخ انور" جس پر تم ریجھے جا رہے ہو۔ اب تو قوم بڑی سٹ پٹائی ہو گی کہ یہ کیا ہو گیا۔ یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ آئے تھے ہم ساتھ لینے کے لئے، اور اس بہانے اپنا اثر ڈالنے کے لئے، لیکن یہاں تو الٹے ہم ہی پھنسے جا رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی اور بولے:

قوم کا فرار

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۵۵)

"انھوں نے کہا " کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے ؟"

انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس وقت کتنی سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی۔ توحید و رسالت، معاد و مسئولیت جیسے اہم مسائل زندگی پر بحث ہو رہی ہے اور اب ان دلائل کو جھٹلانے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں، لیکن جب وہ عقاید و نظریات بدلنے کے لئے تیار ہی نہ تھے، اور یہ طے کئے بیٹھے تھے، تو کیسے قائل ہو جاتے۔ چنانچہ انھوں نے اس سنجیدہ گفتگو کو چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کی، اور راہِ فرار اختیار کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ لیکن مقابل میں جو شخصیت تھی وہ کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ وہ جس سے مخاطب تھے، وہ اللہ کا فرستادہ، اس کا رسول تھا۔ جس کا سینہ وحیٔ الٰہی سے منور تھا۔ اور قوم کی نفسیات سے پوری طرح باخبر۔ وہ انھیں فرار کی اجازت کیسے دے سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کہا۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۵۶)

"اس نے جواب دیا " نہیں، بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے، جو زمین اور آسمانوں کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔"

یعنی باوجود دلائل کے، اگر تم حقیقت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہو تو آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں، کہ تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا رب وہ ہے۔ جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اور اُن کا انتظام بھی کر رہا ہے۔ اُس نے انھیں پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا ہے۔ بلکہ ہر آن اُن کی نگرانی بھی کر رہا ہے، اُن کی ضروریات بھی پوری کر رہا ہے اور ان کا اور ان کے درمیان جو چیز بھی ہے، ہر چیز کا انتظام بھی کر رہا ہے۔ یہی ذات ہے۔ جو تمہارا رب بننے کے لائق ہے، اور یہ کوئی سنی سنائی بات نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ میں ان سب کا عینی

شاہد ہوں۔ اس لئے اس کی حقانیت پر گواہی دیتا ہوں۔

قوم جب اس مدلّل گفتگو سے لاجواب ہوگئی تو اُس نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا کہ اچھا بھئی ان باتوں کو تو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ ساتھ چلتے ہو یا نہیں، ہم تو چلتے ہیں۔

دعوت کی عملی دلیل

حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم کے طور اطوار سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس کی کٹ حجتی، ہٹ دھرمی اور دینِ آبا سے وابستگی ان پر عیاں تھی، اور ابھی ابھی قوم کی گمراہی کا جو تازہ مشاہدہ ہوا، اس سے آپ اس نتیجے پر پہونچے کہ یہ قوم صرف لفظی دلائل سے بات ماننے والی نہیں، اس لئے اب اس کے سامنے ایسی عملی دلیل پیش کی جائے کہ اُس کے بعد اس کے لئے فرار کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ آپ نے سوچا کہ یہ موقع غنیمت ہے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ انھیں تو چلتا کرنا چاہیے اور اپنی اسکیم بروئے کار لانا چاہیے۔ ان کے ساتھ جانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ انھیں تو بات ماننا نہیں ہے، وقت ہی خراب ہوگا۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ ○ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ○ (الصّٰفّٰت: ۸۸، ۸۹)

"پھر اُس نے تاروں پر نظر ڈالی اور کہا میری طبیعت خراب ہے"

قوم تو پہلے ہی سے جانے کے لئے تلی بیٹھی تھی۔ اس جواب نے اُسے بھاگنے کا فوری موقع فراہم کر دیا۔ لیکن ابراہیمؑ نہ تو خود نچلے بیٹھ سکتے تھے اور نہ قوم ہی کو نچلا بیٹھنے کی اجازت دے سکتے تھے۔ کہ آپ نے چلتے چلتے ان کے دل میں یہ کہہ کر نئی خلش پیدا کر دی کہ

وَتَاللّٰهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ بَعْدَ أَنْ تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ ○

(الانبیاء: ۵۷)

"خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے بتوں کی ضرور خبر لوں گا۔"

گو ابراہیمؑ نے یہ بات پوری سنجیدگی سے اور پورے غور و فکر کے بعد کہی تھی، لیکن قوم، جو شرک میں سر سے پیر تک ڈوبی ہوئی تھی، یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اُن کے ہوتے ہوئے ان کے بتوں کو کوئی ہاتھ بھی لگا سکے گا۔ اس لئے اُس نے اس چیلنج کا کچھ زیادہ نوٹس نہ لیا۔ اور وہ ابراہیمؑ کو چھوڑ کر رنگ رلیاں منانے کے لئے چلی گئی۔ اس واقعہ کو قرآن مجید نے

یوں بیان فرمایا ہے

فَتَوَلَّوۡا عَنۡهُ مُدۡبِرِيۡنَ ○ (الصّٰفّٰت: ۹۰)

"چنانچہ وہ لوگ اُسے چھوڑ کر چلے گئے۔"

حضرت ابراہیمؑ کی جرأتِ مومنانہ

قوم کے چلے جانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کا مصمم ارادہ کرلیا اور اُسے بروئے کار لائے۔ پھر کیا ہوا؟ اس کو قرآن مجید ہی کے الفاظ میں سنیئے۔

بُت شکنی

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۝
فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ۝ (الصّٰٓفّٰت: ۹۱-۹۳)

"اُن کے پیچھے وہ چپکے سے اُن کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا "آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں؟ کیا ہوگیا، آپ لوگ بولتے کیوں نہیں؟ اُس کے بعد وہ اُن پر پل پڑا، اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں"

سیدھے ہاتھ سے ضربیں لگانے کا اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ذکر اس لئے کیا ہے کہ یہ شعار اسلامی میں سے ہے اور ایک مسلم کا امتیازی نشان۔ ایک مسلمان جو بھی اچھا کام کرتا ہے وہ داہنے ہاتھ سے شروع کرتا ہے۔ چنانچہ اس ہی بناء پر نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ کھانا کھائیں تو سیدھے ہاتھ سے۔ وضو کریں تو داہنے ہاتھ سے شروع کریں، کوئی کھانے کی چیز تقسیم کریں تو داہنی جانب سے۔ اور جتنے نجاست کے کام ہیں وہ بائیں ہاتھ سے کیے جائیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمانبردار بندوں کو "اصحاب الیمین" دائیں بازو والے کہا، اور جہنمیوں کو بائیں بازو والے "اصحاب الشمال" کہا ہے۔ میدان حشر میں جنتیوں کو دائیں جانب سے اعمال نامے دیے جائیں گے، اور دوزخیوں کو بائیں ہاتھ کی جانب پیچھے سے ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ حقیقت اس طرح مبرہن ہے کہ ہر بدکار، ملحد، دشمنِ خدا، سرکش اور فتنہ پرداز اپنے آپ کو بائیں بازو والا ہی کہتا ہے۔ اب وہ تو دہی سوچ

لیں کہ اللہ کے نزدیک ان کا کیا مقام ہے، اور ان کا کیا انجام ہونے والا ہے۔

ابراہیم ؑ نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اُن کے بتوں کو پاش پاش کیا، بلکہ اُس میں لطیف نکتہ پیدا کیا اور ایک زبردست دلیل پیش کی۔ وہ نکتہ کیا تھا۔ سنیئے:

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ۝۔

(الانبیاء: ۵۸)

"چنانچہ اُس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور صرف ان کے بڑے کو چھوڑ دیا۔ تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

اُس عملی دلیل کی معنویت

اس پوری کارروائی کی معنویت سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم واقعات کی ترتیب پر پھر ایک نظر ڈال لیں۔

پہلے حضرت ابراہیم ؑ نے اپنی قوم کو نوٹس دیا کہ میں تمہارے بتوں کے ساتھ کچھ کارروائی کروں گا، تاکہ وہ جب تکمیلِ کارروائی دیکھیں تو ان کا ذہن کسی اور کی طرف منتقل نہ ہو۔ اور حضرت ابراہیم ؑ ان کو دن کی روشنی میں جو حقیقت سمجھانا چاہتے تھے وہ شبہ اور غیر یقینی حالت کی وجہ سے دھندلا نہ جائے۔ دوسرے انھیں اُس جرأتِ ایمانی سے بھی واقف کرانا چاہتے تھے جو بندۂ مومن کے سینہ میں پنہاں ہوتی ہے۔ مومن، لومڑیوں کی طرح گھات لگا کر داؤ نہیں لگاتا۔ بلکہ جب وہ مقابلہ پر آتا ہے تو مردانہ وار آتا ہے، دن کی روشنی میں آتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ آتا ہے۔

پھر حضرت ابراہیم ؑ نے بتوں سے جو مکالمہ کیا وہ اس لئے نہ تھا کہ شاید آپ یہ سمجھتے تھے کہ یہ بُت بولتے ہیں اور سنتے ہیں۔ اس حقیقت کو تو وہ پہلے ہی ظاہر کر چکے تھے کہ یہ مٹی اور پتھر کے بے جان بُت بالکل بے بس ہیں۔ یہ اپنی حفاظت کے لئے خود دوسروں کے محتاج ہیں، دوسروں کی داد رسی کیا کریں گے۔ یہ مکالمہ اس لئے کیا گیا تھا کہ کل کو جب پوچھ گچھ ہو گی تو میں کہہ دوں گا کہ بھئی میں نے ان سے بہت سر مارا۔ لیکن یہ بولے ہی نہیں، شاید اس طرح سے ان کی عقل میں یہ بات دھنس جاتی کہ ہم کن مٹی کے مادھوؤں کے پیچھے پڑے

ہوئے ہیں جو جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے، وہ رہنمائی کیا خاک کریں گے۔

پھر آپ نے چھوٹے بتوں کو توڑ کر بڑے بت کو باقی رہنے دیا۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ جب وہ جھنجھلا کر اس جرمِ بت شکنی میں مجھے پکڑیں گے۔ تو پھر مجھے ایک موقع اور ہاتھ آئے گا، جس سے میں ان کے بتوں کی بے بسی، ان کی عقلوں کا اندھا پن اور ان کی کھلی ہوئی گمراہی پر گرفت کر سکوں گا اور حقیقت کی طرف ان کی رہنمائی کر سکوں گا۔

اگلے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ابراہیمؑ اپنی اسکیم سے جو نتائج برآمد کرنا چاہتے تھے وہ بالکل اسی طرح برآمد ہوئے اور ایک مرتبہ تو قوم کو ایسا جھنجھوڑ دیا کہ اس کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ ہدایت قبول کرنا نہ کرنا تو قوم کا کام تھا، لیکن ہدایت کی طرف رہنمائی کرنا تو اللہ کے رسول ہی کا کام ہے۔

تلاشِ "مجرم"

غرض یہ کہ جب قوم اپنے میلے ٹھیلے سے واپس آئی۔ تو یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی کہ اس کے سارے ہی معبود شکستہ و بریدہ، لولے لنجے، ٹوٹے پھوٹے پڑے ہوئے ہیں اور اور ان کے بھادیو صاحب سلامت ہیں۔ اس پر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں، سرگوشیاں کرنے لگے:

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ (الانبیآء: ۵۹)

"کہنے لگے، ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی ظالم تھا وہ"

یہ تو وہ بھی جانتے تھے کہ یہ بڑے میاں جو بچ رہے ہیں، وہ یہ حرکت نہیں کر سکتے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ یہ مادھو جی نہ بول سکتے ہیں، نہ ہل سکتے ہیں۔ اس لئے یہ کام کسی اور ہی کا ہے۔ اب تلاش شروع ہوئی کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا چیلنج ان کے دماغوں کے نہاں خانوں میں موجود ہوگا۔ یاد کر کے بولے:

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى یَّذْكُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِیْمُ ○

(الانبیآء: ۶۰)

"(بعض لوگ) بولے۔" ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے جس کا نام ابراہیمؑ ہے۔

ابراہیمؑ کا نام سنتے ہی اچھل پڑے ہوں گے اور واقعات کی ساری تصویر آنکھوں میں پھر گئی ہو گی اور پھر وہ چیلنج بھی یاد آ گیا ہو گا۔ جو چلتے چلتے حضرت ابراہیمؑ نے دے دیا تھا کہ "خدا کی قسم، تمہارے پیچھے تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔"

بس اب کیا تھا، دوڑو پکڑو کا شور اٹھا اور تڑپ کر بولے۔

قَالُوْا فَأْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ○ (الانبیاء: ۶۱)

"انھوں نے کہا "پکڑ لاؤ اُسے سب کے سامنے تاکہ لوگ دیکھ لیں (اُس کی کیسی خبر لی جاتی ہے)

اب کیا تھا، دوڑو پکڑو کی صدا سنتے ہی یہ بپھرے ہوئے لوگ حضرت ابراہیمؑ کی طرف دوڑ پڑے۔

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ○ (الصّٰفّٰت: ۹۴)

"(واپس آ کر) وہ لوگ بھاگے بھاگے اُس کے پاس گئے"

اور ابراہیمؑ کو کشاں کشاں پکڑ لائے اور ابراہیمؑ کو اس "عوامی عدالت" میں پیش کیا گیا جو خدا کے باغی، دین کے دشمن اور عقل و خرد سے عاری اور دینِ آبا کے تعصب میں مبتلا تھی۔ آتے ہی ان کے چودھریوں نے حضرت ابراہیمؑ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بولے:

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○ (الانبیاء: ۶۲)

"بولے۔ کیوں ابراہیمؑ، تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے"

تبلیغ دین کا خداداد موقع

ابراہیمؑ کے لئے یہ موقع خداداد تھا۔ آپ تو چاہتے تھے کہ کوئی ایسا موقع ملے کہ عوام کو براہِ راست مخاطب کیا جائے اور اُس جال کو کاٹا جائے جو ان کے چودھریوں اور پنڈتوں نے عوام کے ارد گرد بُن رکھا تھا۔

دن کے اُجالے میں، عقل کی روشنی میں دلائل کے ساتھ عوام کو قائل کرنا انبیاء علیہم السلام اور داعیانِ حق کا دستور رہا ہے۔ اس سے پہلے کشتی بناتے وقت الیاسی

موقع حضرت نوحؑ کو ملا جب لوگ آ آ کر حضرت نوحؑ کا مذاق بناتے تھے۔ تو انھوں نے کہا تھا کہ تمہیں جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ کون مذاق اڑائے جانے کے قابل ہے۔

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ○ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ○ (هود: ۳۸-۳۹)

"اس نے کہا کہ (آج) تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو، کل ہم ہی تمہارا مذاق اڑائیں گے، جیسا تم کرتے ہو۔ تمہیں جلد پتہ چل جائے گا کہ رسوا کن عذاب کس پر آتا ہے اور اُس پر ڈیرے ڈال دیتا ہے۔"

ایسا ہی ایک موقع صالحؑ کو ملا تھا۔ جب ان کی قوم اُن سے زچ آگئی تھی۔ اور کہتی تھی لے آ وہ عذاب جس کی دھمکیاں دیتے ہو۔ چنانچہ انھوں نے ان عقل کے اندھوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ○ (هود: ۶۳)

"اُس نے کہا، اے میری قوم، کہا تم نے دیکھا کہ اگر میں کھلی ہوئی ہدایت پہ ہوں، اور میرے رب نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہو، تو اُس دن میری مدد کون کرے گا، اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں؟ سو تم میرا کچھ نہیں بگاڑتے، اپنے ہی نقصان میں اضافہ کر رہے ہو۔"

اور ایسے ہی ایک خطابِ عام کا موقع موسیٰؑ کو ملا تھا، جب فرعون اور اُس کے سرداروں نے حضرت موسیٰؑ کو ایک کھلے میدان میں مقابلے کے لیے للکارا تھا۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ○ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ○ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ○ (طٰہٰ: ۵۹-۶۱)

"موسیٰ ع نے کہا کہ اچھا جشن کا دن طے ہوا ۔ اور یہ کہ دن چڑھے لوگ جمع ہوں ۔
پس فرعون پلٹا ، اور اپنے سارے داؤ جمع کر کے آیا ۔ موسیٰ ع نے اُن سے
کہا کہ تم پر خرابی ہو ۔ اللہ پر جھوٹ نہ باندھو ۔ وہ اپنے عذاب سے تمہارا
ستیاناس کر دے گا ۔ بے شک نامراد و خوار ہوا جس نے خدا پر افترا پردازی
کی ۔"

جس طرح انبیاء علیہم السلام کا یہ دستور تھا کہ ایسے نفسیاتی مواقع پر عوام کے سامنے بھرپور طریقے سے اپنی دعوت پیش کرتے تھے اسی طرح اللہ کے مجرموں کا بھی یہی طور رہا ہے کہ وہ عوام کو بھڑکانے کے لئے ایسی عوامی عدالتوں کا ڈھونگ رچاتے ہیں ، کہ ایک ہی ہلّہ میں اپنے مخالف کو ختم کر دیں اور عوامی ردعمل کی تائید حاصل ہو جائے ، مگر افسوس ہے کہ کم ہی لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اس دنیا میں وہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے جو انسان سوچتا ہے ۔ بلکہ وہ ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے ، اور اس انداز سے ہوتا ہے کہ ان کا وہاں تک وہم و گمان بھی نہیں پہنچتا ۔

اگر ابراہیم ع خدا کے نبی نہ ہوتے تو اس دہشت ناک اور بپھرے ہوئے ماحول کو دیکھ کر فوراً ہی گھبرا جاتے اور خدا جانے کہ اس سوال کا کیا جواب دیتے ، لیکن یہ تو انبیاء علیہم السلام ہی کی شان ہوتی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی استقامت کا پہاڑ ثابت ہوتے ہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے ——— جو انھیں ہر وقت حاصل ہوتی ہے ——— خطرناک ترین مواقع پر اطمینان و سکون سے رہتے ہیں اور کسی قسم کی گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوتے ۔ چنانچہ ابراہیم ع نے نہایت طمانیت قلب کے ساتھ جواب دیا ۔ اور ایسا جواب دیا ——— کہ بات مخاطبین ہی پر الٹ کر جا پڑی ۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کا موقف کتنا کمزور اور بودا ہے ۔ آپ نے فرمایا :

مسکت جواب

قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا
يَنْطِقُونَ ○ (الانبیاء : ۶۳)

"اُس نے جواب دیا " بلکہ یہ سب کچھ ان کے اسی سردار نے کیا ہے ، ان ہی سے پوچھ لو ۔ اگر یہ بولتے ہوں ۔ "

اس جواب سے اُس حکمت پر بھی روشنی پڑتی ہے جو ابراہیمؑ نے بڑے بُت کو صحیح سلامت رکھ کر اختیار کی تھی ۔ اس جواب نے نہ صرف ان کے باطل عقاید کی بنیادیں ڈھادیں ۔ بلکہ عوام کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ اس جواب کے مضمرات پر غور کریں ۔ جو لوگ اپنے معبودوں کو مختارِ کل سمجھتے تھے ، جن کو وہ اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھتے تھے ، جن کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ دعا کو سنتے اور شرفِ قبولیت عطا کرتے ہیں ، اُن سے اگر یہ کہا جاتا ہے کہ بھئی ان ہی بتوں سے پوچھ لو کہ تمہارا یہ حال کس نے کیا ہے ، تو یہ بڑی معقول بات تھی ۔ پھر اس کے لئے ایک قرینہ کی شہادت یہ بھی تھی ۔ کہ بڑے حضرت صحیح سلامت تھے ۔ اب اگر وہ صاحبِ قدرت ہیں تو ان کے سوا یہ کام کون کر سکتا ہے ؟ یہ ان کے سوال کا مسکت جواب بھی تھا ۔ اور ان کی گمراہی پر دلیل بھی ۔ یہ جواب سن کر مجمع پر سناٹا چھا گیا اور پھر ؟

فَرَجَعُوٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

(الانبیآء : ۶۴)

"یہ سن کر وہ لوگ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (دلوں میں) کہنے لگے " واقعی تم خود ہی ظالم ہو ۔ "

اسے کہتے ہیں خدائی حجّت اور وحی کی رہنمائی ۔

" لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا "

اب وہ حقیقتِ حال کے بالکل قریب آچکے تھے ۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ ان بتوں کو انھوں نے خود ہی گھڑا ہے ۔ ان میں نہ بولنے کی طاقت ہے ۔ اور نہ حرکت کی سکت ۔ اس لئے وہ کیا جواب دیں گے ۔ اس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ، لیکن اتنا سمجھنے کے بعد بھی ان کا اندھا تعصب اور دینِ آبا کی بے شعور اور غالی عقیدت نے انھیں راہِ ہدایت پر آنے نہ دیا ۔ واقعی اندھی اور غالی عقیدت چیز ہی ایسی ہے ۔ کھسیانے ہو کر بولے :

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (الانبیآء : ۶۵)

"مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی، اور بولے "تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں"۔

ابراہیم ؑ نے دیکھا کہ لوہا گرم ہے۔ اب اس پر ایک چوٹ لگانے کی ضرورت ہے۔ قوم لاجواب ہو گئی ہے اور سوچنے پر مجبور ہو گئی ہے، یہ بہترین موقع ہے کہ اس کے سامنے اپنی دعوت مدلل طریقے سے پھر پیش کر دی جائے۔

'شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات'

مزید دلائل

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ○ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ○

(الصّٰفّٰت: ۹۵-۹۶)

"اس نے کہا "کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنھیں تم بناتے ہو۔"

مخاطب کے اقرار پر اپنی دلیل کی بنیاد رکھنے کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی، لیکن انھیں تو محض مقابل کو قائل کرنا ہی نہ تھا، اسے راہِ راست بھی دکھانا تھی۔ اس لئے مزید فرمایا:

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ؕ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

(الانبیاء: ۶۶-۶۷)

"ابراہیم ؑ نے کہا "پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں، نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو، کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟"

ذات باری کی توحید اور شرک کی بے بضاعتی پر بھرپور دلیل تھی، ان کے لئے جو سمجھنا چاہتے اور راہ راست حاصل کرنا چاہتے، لیکن قوم کا مقصود ہدایت حاصل کرنا نہ تھا۔ بلکہ اپنے معبودوں کا انتقام لینا تھا، خاص طور پر پنڈتوں اور مہنتوں کے لئے تو یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ انھیں اپنے خدائی حقوق خاک میں ملتے نظر آنے لگے۔ عوام کی

پُرعقیدت جبینیں غائب ہوتی نظر آنے لگیں۔ نذرانوں کی بدولت جو ٹھاٹ باٹ کی زندگی قائم تھی، وہ اجڑتی نظر آئی، تو انھوں نے فوراً اپنے معبودوں کی عزت کی دہائی دی اور عوام کو بیوقوف بنا کر بھڑکانے کے لئے چلّائے کہ:

قوم کا غیظ و غضب

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ۝ (الانبیاء: ۶۸)

"چیخے" جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی، اگر تمہیں کچھ کرنا ہے۔"

اور مشورہ دیا:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝ (الصّٰفّٰت: ۹۷)

"بولے "اس کے لئے ایک الاؤ تیار کرو، اور اسے دہکتی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔"

یہ ہے مشرکوں کی وہ عقلیت پرستی اور رواداری، جس کا ہر زمانہ میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ آج سے چار ہزار سال پہلے مشرکوں کی جو ذہنیت تھی، آج بھی اس میں سرِمو فرق نہیں آیا۔ سچ کہا حکیم الامت نے۔ ؏

'آگ ہے، اولاد ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے'

ابراہیمؑ کی مدلّل تقریر کا جواب کیا ملتا ہے؟ یہ کہ ہمارے معبود بولتے ہیں۔ صاحبِ قدرت ہیں۔ اور اُن عیوب سے پاک ہیں۔ جو تم بیان کرتے ہو۔ نہیں، بلکہ یہ کہ اِسے آگ میں ڈال کر جلا دو، ورنہ تمہارے خداؤں کی خدائی سب ختم ہو جائے گی۔ ان کی پکار کہ اپنے معبودوں کی مدد کرو، تو محض ایک چال تھی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں خود اپنی خدائی کی موت نظر آ رہی تھی۔ جو انھوں نے لوگوں پر مسلط کر رکھی تھی۔ شاید ان ہی مشرکوں سے فرعون اور اس کے سرداروں نے یہ تکنیک سیکھی تھی کہ جب موسیٰؑ فاتح و کامران نظر آنے لگے تو انھوں نے فوراً ہی دہائی دینا شروع کی، کہ

قَالُوا إِنْ هَٰذَانِ لَسَاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَن يُخْرِجَاكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ ۝ (طٰہٰ: ۶۳)

"بولے" یہ دونوں محض جادوگر ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے

تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمہاری مثالی طریقِ زندگی کا خاتمہ کر دیں۔"

اللہ تعالیٰ نے قومِ ابراہیمؑ کی اس ہی جاہلانہ، غیر معقول، اندھی بہری متعصب ذہنیت کو دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

(العنکبوت: ۲۴)

"پھر اُس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا "قتل کر دو اسے یا جلا ڈالو اس کو" آخر اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا، یقیناً اس میں نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانے والے ہیں۔"

یہ ہے ان مشرکوں کی عقلیت پسندی اور رواداری کی حقیقت کہ جب دلیل سے ہر فی بازی نہ بچا سکیں اور حقائق کا سامنا نہ کر سکیں تو فریقِ مقابل کا خاتمہ کر دو، خواہ کیسے ہی ظالمانہ اور بہیمانہ طریقے کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں۔ جو ہاں میں ہاں نہ ملائے وہ قابلِ دار ہے۔ اپنے مخالفین کو قتل کرنا، ان کو نیست و نابود اور ان پر دنیا تنگ کر دینا، کچھ آج ہی کے سیاسی غنڈوں کا وطیرہ نہیں، ہزاروں سال پہلے ان کے یہ اُستاد ان کو سکھا گئے ہیں۔

قوم، حضرت ابراہیم کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہتی تھی، اس کا اس نے برملا اظہار کر دیا، اور "یہ عوامی عدالت" جو فیصلہ سنانا چاہتی تھی، سنا چکی، لیکن ابھی اس پر عمل درآمد کرنا باقی تھا۔ باوجودیکہ ابراہیمؑ یکہ و تنہا ہی تھے۔۔۔اور حامیانِ حق ہمیشہ قلیل ہی ہوتے ہیں۔۔۔ ابراہیمؑ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ حق کی ہیبت کچھ ہوتی ہی اتنی شدید ہے کہ مخالفین اپنی کثرتِ تعداد کے باوجود مرعوب ہوتے ہیں۔ تاریخ نے اُس کا بار بار مشاہدہ کیا ہے۔ اور اب یہ قوم بھی دیکھ ہی رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک دوسری ہی ترکیب سوچی۔

حق کا مزاج

قوم ابراہیمؑ کے والد کے پاس پہونچی جو شاہی دربار میں بڑا مقام رکھتا تھا۔ اُسے اپنا فیصلہ سنایا، اور اس کی مدد چاہی - آہ! یہ باپ بھی کیا باپ تھا ــــــ شاید وہ بتانِ سنگ کو سجدہ ریزی کرتے کرتے خود بھی سنگدل ہوگیا تھا ــــــ اپنے ہی بیٹے کے خلاف ــــ اور وہ بیٹا بھی کیسا ہونہار بیٹا جو یگانۂ روزگار، گلستانِ انسانیت کا گُلِ سرسبد، چمنستانِ توحید کا مہکتا پھول، دعوتِ اسلامی کا علمبردار، ایک عالم کا رہنما بننے والا، اور ابوالانبیاء کے لقب سے سرفراز ہونے والا ــــــ اپنے ہی والد کے ظلم و ستم کا شکار ہوگیا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں، تاریخ عالم اس کا بار بار نظارہ کرچکی ہے۔ آخر مصعبؓ بن عمیر کو ان کی والدہ اور چچا ہی نے نشانۂ ستم بنایا تھا۔ عثمانؓ بن عفان پر اُن کے چچا نے ہی مشقِ جور کی تھی - سرورِ عالمؐ کا چچا ابولہب ہی سب سے بڑھ کر درپۓ آزار تھا۔ یہ دعوتِ حق کچھ چیز ہی ایسی ہے کہ اپنوں کو بیگانہ اور غیروں کو یگانہ بناتی ہے - سچ کہا تھا مسیحؑ نے کہ؛

"میں باپ کو بیٹے سے، ماں کو بیٹی سے، اور بھائی کو بھائی سے جدا کرنے آیا ہوں"۔

باپ، جو اپنے بیٹے سے پہلے ہی بیزار بیٹھا تھا، اس "خدمت" شاہ و گدا کو انجام دینے کے لئے تیار ہوگیا - اور شاہ والامدار کی خدمت میں فریاد گزار ہوا - شاہ معظم "نمرود" پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کی انقلابی دعوت "ربوبیت رب العالمین" میں وہ نئے انقلاب کی بو سونگھ رہے تھے - انھیں اپنی ربوبیت کا تخت چوبیں لرزتا نظر آرہا تھا - ان معبودانِ باطل ــ بتوں ـــــ کے نام پر جو "مقدس" کاروبار جاری کر رکھا تھا اور اُن سے حسب و نسب جوڑ کر جو خدائی اختیارات اپنے لئے مختص کر لئے تھے، وہ سب ابنارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹتے نظر آرہے تھے - فوراً ہی اس سنگدل باپ کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو حاضر کرنے کا حکم دیا - شاید ابھی دماغ میں یہ وہم باقی تھا کہ ابھی تو یہ لڑکا ہی ہے، میں ایک زمانے کی ہوا دیکھ چکا ہوں، اپنے علم و تجربہ کی بنا پر اس کو لاجواب کردوں گا - اور پھر وہ عبرت ناک سزا دوں گا کہ آنے والے کان پکڑیں - اس کے اس خنّاس کی کیفیت قرآن مجید نے یوں بیان کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ (البقرہ: ۲۵۸)

"کیا تم نے اُس شخص کو نہیں دیکھا۔ جو ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا، محض اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی"

اقتدار وقت سے فیصلہ کن تصادم

یہ حکومت کا نشہ، طاقت کا پندار، قوت کا گھمنڈ ہوتا ہی ایسا ہے کہ بڑے بڑوں کے دماغ خراب کر دیتا ہے۔ اب اگر اس بیچارے نمرود کا دماغ خراب ہو گیا تو کون سی نئی بات ہوئی۔ بڑے طنطنہ سے بولا کہ اس ملک کا " رب " تو میں ہوں۔ یہاں میرا حکم چلتا ہے، میرا اقتدار ہے، لوگوں کی قسمتوں کا میں مالک ہوں کہ اُن سے جیسے چاہوں کھیلوں، تم یہ کون سا رب لے آئے جو مجھ پر بھی حکمرانی کرے گا اور جسے تم "رب العالمین" کہتے ہو؟ رب تو وہ ہے جس کا لوگ حکم مانیں، جس سے لوگ خوف کھائیں، جو سب پر حکمراں ہو، لیکن اُس سے کوئی نہ پوچھ سکے۔ یہ سب حیثیتیں تو مجھے حاصل ہیں۔ پھر کسی نئے رب کی کہاں گنجائش ہے؟

ابراہیمؑ کے لئے یہ سوال کوئی عقدۂ لاینحل نہ تھا۔ ان کی تو دعوت کی ابتدا ہی اس سے ہوتی تھی۔ کہ دنیا میں جتنے اقتدار ہیں وہ سب باطل ہیں۔ اقتدار و فرمانروائی تو سب اللہ رب العالمین ہی کو زیب دیتی ہے۔ تمام انسان خدا کی مخلوق ہیں اور کسی مخلوق کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ خود خدائی اختیارات سنبھالنے کا دعویٰ کرے۔ چنانچہ انھوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ (البقرہ: ۲۵۹)

" جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے۔ جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے "

یہ اُس ہی بات کا اعادہ ہے۔ جو آپ پہلے قوم کے سامنے بیان کر چکے تھے کہ

وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝ (الشعرا: ۸۱)

" جو مجھے موت بھی دے گا۔ اور پھر زندہ بھی کرے گا "

نمرود نے جب یہ سنا کہ موت و زندگی کا دینا ربوبیت کا استحقاق ہے تو دل میں کہنے لگا۔
کہ پھر تو مجھ سے زیادہ "رب" بننے کا حقدار کون ہے۔ میرے تو یہ بائیں ہاتھ کا کام ہے کہ جس
کو چاہوں مروا دوں، اور جس کو چاہوں پھانسی کے تختہ سے اتار دوں۔ یہی کچھ سوچ کر بولا۔

قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ○

"تو اُس نے جواب دیا " زندگی اور موت تو میرے اختیار میں ہے "

سمجھا ہوگا کہ اب بازی مار لی لیکن ابراہیمؑ تو وحی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے۔
ہدایتِ ربّانی ان کی رہنمائی کر رہی تھی۔ آپ نے فوراً دوسری دلیل پیش کی۔ فرمایا۔

قَالَ اِبْرٰاهِمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ
بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ○ (البقرہ: ۲۵۸)

"ابراہیم علیہ السلام بولے، اچھا اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے،
تُو ذرا مغرب سے نکال کر دکھا۔"

یہ ایسی شاہ دلیل تھی کہ نمرود کے بس سے باہر تھی۔ اس دلیل کا توڑ فراہم کرنا بڑی ہی
ٹیڑھی کھیر تھی۔ خدائی کا دعویٰ کرنا آسان ہے، لیکن اس کو ثابت کرنا کسی کے بس میں نہیں۔ بھرے
دربار میں ملکِ معظم کی کرکری ہوگئی اور لاجواب ہو گئے۔ قرآن مجید نے اُس کی اس حالت کا نقشہ
یوں کھینچا ہے۔

فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ؕ

"یہ سن کر وہ منکرِ حق مبہوت رہ گیا۔"

اگر اُس کے بس میں اس کا ایک فیصد بھی امکان ہوتا۔ تو وہ آخری داؤ بھی لگا دیتا۔ لیکن
یہاں تو کاٹھ کی ہنڈیا تھی جو پہلی ہی آنچ پر جل گئی۔

اگر نمرود طالبِ حق ہوتا تو اس دلیل پر غور کر کے صحیح نتیجہ پر پہونچ سکتا تھا، لیکن
اقتدار کا نشہ اور طاقت کا زعم ایک مغرور و متکبر انسان کو سوچنے کا موقع کم ہی دیتا ہے، اور ایسے
مواقع پر اس جھنجھلاہٹ میں کچھ اضافہ ہی ہو جاتا ہے، حق کے نزدیک آنے کی بجائے کچھ اور
ہی دور چلا جاتا ہے۔ ایسے برخود غلط انسان کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق نہیں دیتا۔

وَاللّٰہُ لَا یَھۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ○ (البقرۃ:۲۵۸)

"اور اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا ۔"

یہ اللہ کا قانون اور اس کی سنت ہے ، جو ہمیشہ سے جاری و ساری ہے اور رہے گی ۔ اب نمرود کے سامنے دو ہی راستے تھے ۔

اقتدار کے ہتھکنڈے

ایک یہ کہ بَرملا اعترافِ حق کر لے اور ابراہیمؑ کے سامنے سرِ اطاعت خم کر کے حلقۂ مومنین میں شامل ہو جائے ۔

دوسرا یہ کہ اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے ان جاہل اور بپھرے ہوئے عوام کی ہاں میں ہاں ملائے اور ابراہیمؑ کو راستہ سے ہٹانے کے لئے آخری اقدام کرے ۔ چاہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کتنے ہی ہولناک مظالم کو اختیار کرنا پڑے ۔

پہلا راستہ وہ پہلے ہی مسترد کر چکا تھا ۔ اس کا کبر و اقتدار ابراہیمؑ کی سیادت ماننے اور ان کی اطاعت کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہو سکتا تھا ، نہ ہوا ۔ دوسرا راستہ اختیار کرنے کے لئے اس نے اپنے وزیروں اور مشیروں کو طلب کیا اور بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال کر زندہ جلا دیا جائے ۔ اس طرح عوام میں واہ واہ بھی ہو جائے گی ، ان کی تائید بھی حاصل ہو جائے گی اور اقتدار بھی محفوظ رہے گا ۔ ان کے اس منصوبے کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے ؟

فَاَرَادُوۡا بِہٖ کَیۡدًا فَجَعَلۡنٰھُمُ الۡاَسۡفَلِیۡنَ ○ (الصّٰفّٰت:۹۸)

"انھوں نے اس کے خلاف کارروائی کرنا چاہی تھی ۔ مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا ۔"

آزمائشِ ابراہیم اور سرخروئی

وہ سمجھے تھے کہ اس طرح ہمارے راستے کا کانٹا صاف ہو جائے گا ، ابراہیمؑ کا نام و نشان مٹ جائے گا ، اور چار سو ہمارا ہی بول بالا ہو جائے گا ، لیکن انسان کی سوچ ہمیشہ ہی بڑی کوتاہ بین ہوتی ہے ۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ جو تدبیر وہ اپنی کامیابی کے لئے اختیار کر رہا ہے ، وہی اس کے زوال کا سبب بنے گی ۔

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

انھیں معلوم نہیں تھا کہ زمین پر فیصلے چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں ۔ ان کا انجام آسمان ہی پر طے پاتا ہے ۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ اصل فیصلہ کن طاقت انسانی تدبیریں نہیں ، بلکہ خدائی فیصلے ہیں جو نظروں سے اوجھل ضرور رہوتے ہیں ، لیکن بالآخر اپنی حقیقت منوا کر رہتے ہیں ۔ ابراہیمؑ کو آگ میں جلانے کی تدبیر بظاہر ابراہیمؑ کو نیچا دکھانے کے لئے کی گئی تھی ، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس ہی کو ابراہیمؑ کی سرخروئی اور نمرودیوں کی ذلت آمیز شکست کا سبب بنایا ۔ ان کی یہ تدبیر کس طرح ناکام ہوئی اور ابراہیمؑ کس طرح سرخرو ہوئے اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر یوں آئی ہے ۔

" عوامی عدالت " اور مجلس وزراء کے فیصلوں کو روبہ کار لانے کے لئے ایک بڑا سا الاؤ تیار کیا گیا ۔ جب آگ خوب دہک چکی تو حضرت ابراہیمؑ کو ایک بڑی سی کرین یا گوپھن یا منجنیق جو کچھ بھی ہو اُس میں بٹھا کر الاؤ میں پھینک دیا گیا ۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اب دھواں اٹھتا ہے ، اب جسم جلتا ہے اور اب ایک راکھ کا ڈھیر نظر آتا ہے ۔ لیکن ،

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی دکھانا منظور تھا ۔ حکم ہوا ۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۙ (الانبیاء:۶۹)

" ہم نے کہا ، اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر ۔ "

ابراہیمؑ ہنستے کھیلتے ، صحیح سلامت آگ میں سے باہر نکل آئے ۔ اور اُن کا بال بھی بیکا نہ ہوا اور اس طرح ان کی ساری تدبیریں خاک میں مل گئیں ۔

عوام پر اس کا جو تاثر مرتب ہوا ہو گا ۔ وہ محتاج بیان نہیں ۔ ابراہیم علیہ السلام کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی ۔ نمرود کی خدائی کی دھجیاں اڑ گئیں اور رب العالمین کے وجود کی ایسی ناقابلِ تردید دلیل سامنے آگئی کہ اسے آنکھوں کا اندھا بھی نہ جھٹلا سکتا تھا ۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا ۔

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝ (الانبیاء:۷۰)

"اور انھوں نے اس کے ساتھ چال چلنا چاہی۔ لیکن ہم نے انھیں بری طرح ناکام کیا۔"

اس ہی لئے اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو ایک مومن کے لئے عظیم نشانی قرار دیا۔

فَأَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۗ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿﴾

(العنکبوت: ۲۴)

"آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچالیا، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانے والے ہیں۔"

یہاں یہ جملہ "یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لئے" نہایت اہم ہے۔ اس ساری عظیم الشان جدوجہد سے جو ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی، صرف وہی سبق حاصل کرسکتے ہیں اور رہنمائی پاسکتے ہیں، جو اہل ایمان ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان سے خالی ہیں، ان کے لئے ایک اس واقعہ میں کیا، کسی بھی بڑے سے بڑے واقعہ میں نہ سبق ہے، نہ نشان عبرت ہے اور نہ ہی کوئی نصیحت ہے۔ یہ "اہل ایمان" کون لوگ ہیں؟

ہدایت پانے والے

یہ وہ لوگ ہیں جو:-

- توحید باری تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر اور ان کی تعلیمات پر صدقِ دل سے ایمان لاتے ہیں۔ انھیں کوئی لالچ، کوئی مصلحت، کوئی وقتی ضرورت ان صداقتوں کو تسلیم کرنے پر مائل نہیں کرتی، بلکہ وہ حق کو محض حق سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔
- ان کے سینے ہر قسم کے شک و ریب سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ جب ایمان لاتے ہیں تو دل کی گہرائیوں سے ایمان لاتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب ایمان لے آئے تو پھر ہر اس ہدایت کی بلاجھجک تصدیق کرتے ہیں، جو انھیں اپنے ہادی و مولا کی جانب سے ملتی ہے۔
- ان کا ایمان محض ماننے کی حد تک محدود نہیں رہتا۔ اللہ اور رسول کی جانب سے انھیں جو بھی ہدایت ملے، اس پر فوراً عمل پیرا ہوجاتے ہیں۔

جس چیز پر ایمان لاتے ہیں اُسے صرف اپنے نہاں خانۂ دماغ میں سجا کر نہیں رکھتے۔ اسے نہ صرف اپنے دل و دماغ جسم و جان پر نافذ کرتے ہیں بلکہ اس کو تمام عالم میں جاری و ساری کرنے کی جہدِ مسلسل میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

- ان کے لئے ان کا دین و ایمان محض ایک نظریہ اور ایک نیک تمنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ان کی زندگی کا ایک ایسا نصب العین اور مقصدِ وجود ہوتا ہے جس کی لگن میں ہر وقت سرشار رہتے ہیں۔ وہ ایک ایسی تڑپ ہوتی ہے جو ہر وقت انھیں بے چین و بے آرام رکھتی ہے۔ وہ اُس ہی کے خواب دیکھتے ہیں اور اس ہی کی آرزو میں مگن رہتے ہیں۔ اس کی سربلندی و سرفرازی کے لئے اپنا تن، من اور دھن سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

مومنین کے لئے نشانیاں

یہی وہ مومنین ہیں جن کے لئے اس واقعہ میں نشانیاں ہیں۔ وہ نشانیاں ہیں کیا؟

- پہلی نشانی یہ ہے کہ ایک بندۂ مومن کبھی قلت و کثرت کے چکر میں نہیں پڑتا۔ وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ اگر مجھے اتنے ساتھی میسر آجائیں تو میں اُس فرض کو انجام دوں گا۔ جب وہ حق کو پالیتا ہے تو پھر اس کی پروا نہیں کرتا ہے کہ اس کے کتنے ساتھی ہیں اور کتنے مخالف۔ وہ تنِ تنہا اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے نکل پڑتا ہے، اور خود اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک امت بن جاتا ہے۔ یہی بات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے۔

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا ؕ وَلَمۡ يَكُ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ ○

"بے شک ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا، اللہ کا مطیع فرماں اور یکسو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔" (النحل: ۱۲۰)

ابراہیم ؑ نے جس وقت دعوتِ دینِ بلند کی اس وقت وہ پوری دنیا میں اکیلے اور تنہا تھے۔ کوئی ان کا ساتھی نہ تھا۔ انھوں نے تنِ تنہا اس بتکدۂ عالم میں اذان دی اور وہ کام انجام دیا جو ایک پوری امت کے انجام دینے کا تھا۔ اس کی طرف بلانا، اس کے اوامر کو قائم کرنا اور اس کے مناہی کو روکنا، ایک اکیلے انسان کے بس سے باہر ہے، اس کے لئے تو ایک پوری

امت درکار ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط (آلِ عمران: ۱۰۴)

"اور تم میں ایک امت (گروہ یا جماعت) ایسی ضرور ہونا چاہیئے جو خیر کی دعوت دے، معروف کا حکم دے اور منکرات سے روکے۔"

یہ پوری امت کا کام ابراہیمؑ نے تن تنہا انجام دیا اور " اُمَّةً قَانِتًا " کا لقب پایا

◉ دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کبھی حالات کے سازگار ہونے کا منتظر نہیں ہوتا۔ حالات سازگار ہوں یا نامساعد، اسے بہر حال اپنے فرض کو انجام دینا ہے، اور وہ انجام دیتا ہے۔ بادِ مخالف کے جھکڑ اس کی قوتِ پرواز کے آڑے نہیں آسکتے۔ وہ سخت ترین مخالفانہ بلکہ معاندانہ ماحول میں بھی اپنے موقف پر سختی سے جما رہتا ہے اور ایک انچ ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور پوری طمانیتِ قلب اور سکون کے ساتھ اعلان کرتا ہے۔

اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَا
اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۚ (الانعام: ۷۹)

"میں نے سب طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف یکسو ہو کر کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں"

راہِ حق میں ابراہیمؑ کو کیا کیا مشکلات پیش نہ آئیں۔ اور کون کون سی مصیبتیں ہیں جو انھوں نے نہ جھیلیں، لیکن ان کے پائے ثبات کو کہیں لغزش نہ آئی۔ باپ نے گھر سے نکالا، قوم نے قتل کرنے اور جلانے کی دھمکیاں دیں، اقتدار نے آگ میں ڈلوا دیا، لیکن کوئی آزمائش، کوئی مصیبت کوئی مزاحمت ان کو اس راستہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی جس کو انھوں نے اختیار کیا تھا۔

تیسری نشانی یہ ہے کہ حالات کیسے ہی مایوس کن کیوں نہ ہوں، راستہ کتنا ہی دشوار گزار کیوں نہ ہو، کامیابی کے امکانات کتنے ہی بعید کیوں نہ ہوں، ظلم و صبر کی گھٹائیں کتنی ہی گھری کیوں نہ ہوں حق بالآخر کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ اور نصرتِ الٰہی ایسے انداز سے آتی ہے کہ اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیمؑ نے جن حالات میں دعوتِ حق بلند کی تھی، کیا اُن کو دیکھ کر کوئی بڑے سے بڑا رجائیت پسند شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ دعوت کبھی کامیاب ہوگی اور کروڑوں انسان اس کے نام لیوا ہوں گے؟ جب ان کو آگ کے آلاؤ میں پھینکا گیا تھا۔ تو کوئی یہ سوچ بھی سکتا تھا کہ وہ اس میں سے نہ صرف زندہ وسلامت نکل آئیں گے، بلکہ یہی واقعہ ان کی عالم گیر دعوت کی کامیابی کی تمہید ثابت ہوگا؟ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو کیا وہ وحشی اور خونخوار قوم حضرت ابراہیمؑ سے مرعوب ہوتی؟ اگر یہ جان سوز واقعہ پیش آتا۔ تو کیا کبھی ہجرت کی نوبت آتی۔ اور یہ دعوت فلسطین ومصر، اردن وحجاز تک پہنچتی اور ان کو مسخر کرتی؟ یہ خدائی تدبیریں ہیں جن تک عقل انسانی کی رسائی ممکن نہیں۔ انسان معاملہ کے صرف ظاہری پہلو کو، اور وہ بھی اس کے محدود حصہ کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کے بطن میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے۔ اس کی خبر صرف خدائے علیم وخبیر کو ہے۔ مخالفین جس تدبیر کو شاہ کلید سمجھتے ہیں، وہی ان کو ذلت ورسوائی کے گڑھے میں پہنچاتی ہے۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝ (الانبیآء: ۷۰)

"اور انھوں نے اس کے ساتھ چال چلنا چاہی اور ہم نے انھیں بُری طرح ناکام کردیا۔"

صرف ناکام ہی نہیں کیا۔ بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے انھیں ذلیل ورسوا کردیا۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت: ۹۸)

"اور انھوں نے اس کے خلاف کارروائی کرنا چاہی، لیکن ہم نے انھیں نیچا کردیا"

یہ باری تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی رہنمائی، ہمت افزائی، اور ثابت قدمی کے لئے ہر دور اور ہر زمانہ میں ایسی بیشمار نشانیاں بھیجیں۔ افسوس ہے اُن مومنین پر جو یہ عظیم نشانیاں اور آثار دیکھنے کے بعد بھی باطل سے ہول کھائیں اور راہِ عزیمت سے فرار کو عافیت سمجھیں۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

جب ابراہیمؑ آگ سے صحیح وسلامت باہر نکل کر آئے تو اس صریح معجزہ کو دیکھ کر لوگ حیران و مبہوت کھڑے تھے۔ زبانوں سے چاہے اقرار نہ کیا ہو، لیکن دل میں تو معترف ہو گئے ہوں گے کہ یہ اپنے دعوے میں قطعی سچا آدمی ہے، اور اس کو صحیح وسلامت بچا لانے والی ہستی، اس کے خدا ہی کی ہوگی۔ قبولِ حق کے لئے یہ ایک ایسا نفسیاتی لمحہ تھا جس کو ایک داعی کسی صورت میں بھی ضائع نہ کر سکتا تھا چنانچہ آپ نے موقع سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر قوم کے سامنے نہایت موثر انداز میں اپنی دعوت پیش کی۔ فرمایا:

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۖ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ (العنکبوت: ۲۵)

"اور اس نے کہا" تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے، مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے۔ اور آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔"

یعنی یہاں تم اپنی گروہ بندیوں، جتھہ بندیوں اور اتحاد کے لئے جو بھی بنیاد بنانا چاہو بنا لو، یہاں تک کہ بت پرستی جیسی غیر عقلی چیز پر تم اکٹھے ہو جاؤ۔ لیکن قیامت کے دن تمہاری یہ ساری بنیادیں ڈھے جائیں گی اور یہی چیز جو شیرازہ بندی کے لئے استعمال ہو رہی ہے کل جب عذاب النار اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے تو یہی بنیادیں آپس میں ایک دوسرے پر لعنت بھیجنے اور بیزاری کا سبب بن جائیں گی، لیکن یہ سب حیلہ طرازیاں اُس دن بیکار ثابت ہوں گی۔ کوئی پچھتاوا اُس دن سودمند نہ ہوگا اور کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا، جو تمہیں اس عذاب سے نکال سکے۔ اس لئے اب اس موقع کو غنیمت جانو اور اس کجروی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی راہِ راست پر آ جاؤ۔

ہجرت ــــــ اشاعتِ حق کیلیے پہلا قدم

جس عظیم شخصیت کے لئے آگ کا بستر پھولوں کی سیج بن جائے۔ اس سے لڑنا اور اس کا مقابلہ کرنا اب کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ابراہیمؑ کے مقابلہ پر اقتدارِ وقت، نمرود اور اس کے عوام نے جس طرح منہ کی کھائی تھی اس نے ان مخالفین کی کمر توڑ دی۔ ابراہیمؑ اس آزمائش سے جس طرح سرخرو ہو کر نکلے، اس سے نہ صرف ان کے وقار میں عظیم اضافہ ہوا، نہ صرف ان کی دعوت کی حقانیت دن کی روشنی میں ثابت ہوئی، بلکہ نہ معلوم کتنے دل ان کی دعوت کے لئے مسخر ہو گئے۔ لیکن اقتدارِ وقت کے خوف سے اظہار ایمان نہ کر سکے۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ اس کھلی شکست پر سرکار اور عوام دونوں ہی، غیظ و غضب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایسے خطرناک موقع پر فریقِ مقابل کی دعوت پر لبیک کہنا۔ اس کے اقرار کا اعلان کرنا، بڑی ہمت و جرأت اور بڑے دل و گردے کا کام تھا، جو ظاہر ہے کہ ہر ایک کے بس کا نہیں ہوتا، لیکن خدا کی یہ زمین ایسے شیر دل حضرات سے کبھی بالکل ہی خالی نہیں رہی ہے۔ اس خطرناک اور وحشتناک موقع پر لوطؑ جو حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ آگے بڑھے اور اپنے ایمان کا اظہار کیا۔

فَـاٰمَنَ لَـهٗ لُوْطٌ ۘ (العنکبوت: ۲۶)

"پس لوط ان کے ہمنوا ہوئے۔"

اور سابقون الاولون میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔

والد کو سمجھانے کی آخری کوشش

گو اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے فتح مبین سے نوازا تھا، لیکن جب ماحول اتنا مخالفانہ بن گیا تھا کہ مزید اس فضا میں دعوت کو پھیلانا اور اُس کے لئے کام کرنا ممکن نہ رہا

تھا۔ پوری قوم کو جو چوٹ لگی تھی ، اس کی کسک وہ رگ و پے میں محسوس کر رہی ہو گی چنانچہ ابراہیمؑ نے فیصلہ کیا ـــــــ اور ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ حکم خداوندی کی روشنی میں ہی ہو گا ـــــــ کہ اب اس سرزمین کو خیر باد کہیں اور ہجرت کر کے دعوت کے لئے کوئی نیا مستقر تلاش کریں۔

اپنے گھر ، اپنے خاندان ، اپنی قوم اور اپنے ملک کو کون شخص بخوشی چھوڑتا ہے۔ ابراہیمؑ کو بھی یہ فیصلہ بڑے کرب و اضطراب کی حالت میں کرنا پڑا ہو گا ، لیکن ایک داعیٔ حق اور مومن و مسلم بندہ کے لیے سب سے زیادہ عزیز شے اس کی دعوت ہوتی ہے۔ اس کے لئے جو بھی قربانی دینا پڑے ، وہ دیتا ہے۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے بھی اپنے مقصد اور اپنی دعوت کی بقاء کی خاطر ہر چیز کو قربان کر کے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایسی ہی کیفیت سے آپ کے عالی مرتبت خلف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دوچار ہونا پڑا تھا ، جب اہلِ مکہ نے آپ کی دعوت کو ٹھکرا کر آپ کو مجبور کر دیا کہ اپنی دعوت کے لئے مستقر کی تلاش میں مدینہ طیبہ ہجرت فرما جائیں۔ آپ رات کی تاریکی میں حرم پاک کی سرزمین کو مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ

"اے مکہ تو مجھے سارے جہان سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے مکین مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے"۔

غرض ابراہیمؑ نے جب ہجرت کا فیصلہ کر لیا ، تو آپ نے اس فطری محبت کے تحت جو ایک بیٹے کو اپنے باپ سے ہوتی ہے ، اپنے سنگدل والد کو پھر سے سمجھانے کی آخری کوشش کی۔ یہ کوشش جہاں ایک خیر خواہ بیٹے کی کوشش تھی وہیں ایک صاحبِ دعوت نبی کا فریضہ بھی تھی۔ اس ہی لئے اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل الفاظ میں اس کا ذکر فرمایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾

"اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو ، بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا" (مریم: ۴۱)

ان کے باپ اور ان کی قوم کا جو معاندانہ اور جارحانہ رویہ تھا ، اس کا دردناک انجام ان کو نظر آ رہا تھا۔ قوم (جس میں والد شامل تھا) ان کے ساتھ جو سلوک کر چکی تھی یا

کر رہی تھی۔ وہ بھی دیکھ چکے تھے اور وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ تھے، لیکن اپنی فطری محبت اور اخلاص کے ہاتھوں مجبور تھے کہ کم از کم اپنے والد کو تو اس آگ سے بچالیں جو ایسے لوگوں لوگوں کو انجام کار میں ملے گی۔ ایسی ہی ذمہ داری کو ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ (الشعراء: ۲۱۴)

"اور اپنے نزدیک کنبہ والوں کو ڈراؤ۔"

اور مزید فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم: ۶)

"اے ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ"

۔اس ازلی اور ابدی ہدایت کے پیش نظر آپ نے والد سے کہا:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝۴۲ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝۴۳ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝۴۴ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝۴۵ (مریم: ۴۲-۴۵)

"جب کہ اُس نے اپنے باپ سے کہا کہ "ابا جان، آپ کیوں اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، جو نہ سنتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابا جان میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے، جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔
ابا جان، آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔
ابا جان، مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔"

یہ ایک دردمند بیٹے کی درد میں ڈوبی ہوئی صدا تھی، جس کے لفظ لفظ سے محبت و

اخلاص ٹپک رہا تھا۔ ماضی، حال، اور مستقبل — ہر زمانے کی شہادتوں سے استدلال کر رہے ہیں، اور سمجھانے کا ہر اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

بتوں کی شکست و ریخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی بے بسی جتاتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ جو اپنی ہی مدد نہ کر سکے وہ تمہارے کیا کام آئیں گے۔ ان ناکارہ و خود تراشیدہ اصنام سے کیا امید رکھتے ہو۔ کیا ابھی ان کا حشر نہیں دیکھا؟ اپنی سرخروئی و کامیابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی رسالت پر استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو جو ہدایت میں لے کر آیا ہوں وہی کامیابی و کامرانی کا راستہ ہے، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دیکھو پوری قوم اور "بادشاہ سلامت"، سب ہی نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا، لیکن انجام کیا ہوا؟ میرا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ جو آگ ہر چیز کو چشم زدن میں خاکستر بنا دیتی ہے، کس طرح اس جہان میں میرے لئے بندۂ بے دام بن کر پھولوں کا بستر بن گئی اور مجھے کوئی نقصان نہ پہونچا سکی۔ اس لئے جو راستہ بتا رہا ہوں اُسے قبول کرو اور اس کو اختیار کرو، دونوں جہان میں سکھی رہو گے۔

دو مختلف کردار

اور دیکھو جس طرح شیطان کے راستے پر چل کر تم سب یہاں ذلیل و رسوا ہوئے اُس طرح اُس جہان میں بھی ذلت و رسوائی ہی ہاتھ آئے گی۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تمہیں اس ذلت و رسوائی سے بچاؤں جو شیطان اور اس کے پیرووں کے لئے مقدر ہے۔

لیکن یہ سب پیاری پیاری، میٹھی میٹھی، شفقت سے لبریز نصیحتیں "چکنے گھڑے پہ بوند" ثابت ہوئیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ان دردمند، پُر خلوص نصیحتوں پر غور و فکر کرتا، اور راہِ ہدایت پر آنے کے لئے تیار ہوتا۔ وہ ہر متکبر و نافرمان کی طرح کچھ اور ہی غضب ناک ہو گیا۔ بھڑک کر بولا۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾ (مریم ۴۶)

"باپ نے کہا "ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز

نہ آیا۔ تو میں تجھے سنگسار کردوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے الگ ہو جا"

اسے کہتے ہیں ؎ "مردِ ناداں پہ کلام نرم و نازک بے اثر"

یہاں پر دو کردار سامنے آتے ہیں۔

ایک کردار آزر، حضرت ابراہیمؑ کے والد کی شکل میں آتا ہے۔ جو ایک ایسے بیٹے کے ساتھ جو انتہائی سعادت مند، ہونہار اور صالح ہے اور اپنے والد کے انتہائی ظالمانہ سلوک کے باوجود آخر وقت تک نہایت اخلاص و دردمندی کے ساتھ اس کو تباہی کے گڑھے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر یہ ظالم باپ محض عقیدہ کے اختلاف کی بنیاد پر اپنے بیٹے کی جان کے درپے ہو جاتا ہے۔ عہدہ و منصب کے لالچ، سرکار کی خوشنودی کے حصول اور اپنی آتشِ غیظ و غضب کو بجھانے کے لئے اپنے ہی جگر گوشہ کو آگ میں ڈالنے کے لئے ظالموں کے سامنے خود پیش کر دیتا ہے۔ یہ سنگدلی کی انتہا ہے۔ واقعی جب انسان خدا کی ہدایت سے بے نیاز اور اُس کے خوف سے خالی ہو جاتا ہے پھر اُسے اُس انتہائی پستی و رذالت سے کوئی نہیں بچا سکتا جس میں وہ گر رہا ہوتا ہے۔

دوسرا حضرت ابراہیمؑ کی شکل میں ایک ایسے صالح بیٹے کا کردار سامنے آتا ہے جس کے ساتھ باپ نے انتہائی شقاوتِ قلبی اور سنگدلی کا مظاہرہ کیا، اس کے باوجود وہ سعادت مند بیٹا آخر وقت تک کوشش کرتا ہے کہ اپنے باپ کو اس آگ کے گڑھے میں گرنے سے بچائے، جس میں وہ گرنے جا رہا ہے۔ اس کے تمام مظالم اور زیادتیوں کے جواب میں اس کے لئے لعنت کا طلب گار نہیں ہوتا، بلکہ اس کے واسطے دعا ہی کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اپنے خدا سے اس کے لئے ہدایت طلب کرتا ہے۔ اور اس کی مغفرت و بخشش کے لئے اپنی بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اولاد پر والدین کے جو حقوق فرض کئے ہیں، ان کی تعمیل میں آخر وقت تک اپنی اخلاص کیشی اور سعادت مندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب دیکھا کہ نہ صرف پوری قوم دشمنی پر اتر آئی ہے بلکہ ان کا باپ تک اس بات کا بھی روادار نہیں کہ اپنے بیٹے کو ساتھ رکھے، تو انھوں نے اپنی ہجرت کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا:

والد کے لیے دعائے مغفرت

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْ رَبِّيْ ڮ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝ (مریم: ۴۷-۴۸)

"ابراہیمؑ نے کہا، سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے، میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنھیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔"

اپنے خدا پر اس درجہ کا بھروسہ اور اپنے خدا سے اس پایہ کا حسنِ ظن، انبیاء علیہم السلام ہی کا حصہ ہے۔ گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں، عزیز رشتہ داروں سے چھوٹ رہے ہیں، ملک و وطن سے نکالے جا رہے ہیں؛ لیکن ان سب کے باوجود یقین کامل یہی ہے کہ میرا رب مہربان بھی ہے اور متوجہ بھی ہے اور کسی حال میں اپنی رحمت سے محروم نہ رکھے گا اور نہ اکیلا چھوڑے گا۔ اگر خدا کی رحمت و کارسازی پر اتنا گہرا یقین نہ ہوتا، تو ایسی شدید آزمائشوں میں قدم ٹکنا محال تھا۔ ایک بندۂ مومن کا سب سے بڑا سہارا خدا کی رحمت ہی تو ہے، جو اُسے ہر حال میں پُرامید رکھتی ہے۔ اور راضی برضا رہنے پر قائم رکھتی ہے۔

گو حضرت ابراہیمؑ نے ازخود دعائے مغفرت کا وعدہ کیا تھا، لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بات بھی صاف طور پر سنادی کہ۔

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (الممتحنۃ: ۴)

"میں آپ کے لئے دعا ضرور کروں گا۔ لیکن میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ کہ آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچالوں"

یعنی باوجود اس کے کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور مستجاب الدعوات ہوں مجھے یقین ہے کہ میرا رب میری درخواست رد نہ کرے گا۔ لیکن تم اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے کام میری دعا آنے والی نہیں؛ بلکہ تمہارے اعمال ہیں، میں دعا کرتا رہوں؛ اور تم اعمال صالح نہ کرو

تو اللہ کے مواخذہ اور پکڑ سے تمہیں کوئی نہ بچا سکے گا۔ اگر اللہ کی اس گرفت سے بچنا چاہتے ہو تو اعمال صالح اختیار کرو۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے دعائے مغفرت کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کرنے کے لئے آپ نے دو مرتبہ دعا فرمائی۔

ایک اس وقت جب آپ خانہ کعبہ سے رخصت ہو رہے تھے، عرض کیا۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ○

(ابراهیم: ۴۱)

"اے ہمارے رب، مجھے اور میرے والدین کو اور سب مومنوں کو اس روز معاف کر دیجیو جب حساب لیا جاتا ہے۔"

اور دوسری اس وقت جب آپ ہجرت کر کے سفر پر روانہ ہوئے تھے، عرض کیا۔

وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ○ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ○ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ○ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ○

"اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بیشک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور مجھے اس دن رسوا نہ کیجیو جب کہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جب کہ نہ مال کوئی نفع دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلبِ سلیم لئے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔"

(الشعراء: ۸۶-۸۹)

ابراہیم علیہ السلام نے ایفائے عہد میں اپنے والد کے لئے دعا کرنے کو تو کر دی لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کے حق میں دعائے مغفرت پسند نہیں فرماتا، تو انھوں نے فوراً ہی رجوع کر لیا اور اپنے اس مقام بلند پر سختی سے ڈٹے رہے جس پر وہ ابتدا ہی سے جمے چلے آ رہے تھے۔ آپ کی اس ہی کامل سپردگی کی اللہ تعالیٰ نے یوں توصیف فرمائی ہے۔

شفقتِ ابراہیمی

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ

إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ○ (التوبہ : ۱۱۴)

"ابراہیم نے اپنے باپ کے لئے جو دعائے مغفرت کی تھی۔ وہ تو اُس وعدہ کی وجہ سے تھی۔ جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا، مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی۔ کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اُس سے بیزار ہوگیا، حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔"

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی سیرت پاک کا ایک اور نیا پہلو سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ وہ اپنے کٹر سے کٹر دشمن کے لئے بھی بددعا کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ بلکہ اُس کے لئے بھی آخر وقت تک طالب مغفرت ورحمت رہتے تھے۔ ان کی اس رافت ورحمت، دردمندی واخلاص، رقتِ قلب اور شفقت کا عکسِ جمیل ان کی اُس دعا میں نظر آتا ہے۔ جو خانۂ کعبہ سے واپسی کے موقع پر مانگی تھی۔ انھوں نے کہا:

رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (ابراھیم: ۳۶)

"اے میرے رب! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیا ہے، پس جو میرا اتباع کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تُو بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

دیکھئے یہاں اپنے مخالفین کے لئے بھی رحمت ومغفرت ہی طلب کر رہے ہیں دوزخ وجہنم نہیں: یہی وہ رحمت ورافت تھی جو آپ کے خلفِ اعظم رحمۃ اللعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ورثہ میں ملی تھی۔ جب طائف کے اوباش اور فسّاق وفجار، رحمت اللعالمین کو پتھر مار مار کر زخمی کر دیتے ہیں۔ اور پائے مبارک خون سے لہولہان ہو جاتے ہیں۔ اور جبریلِ امین ان ظالموں کی تباہی کی اجازت طلب کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے

رَبِّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ

"اے میرے رب میری اس قوم کو ہدایت دے کہ یہ جانتے نہیں ہیں کہ کیا کر رہے ہیں۔"

غرض ابراہیمؑ نے جب دیکھ لیا کہ اب سرزمین میں دعوت کے پھیلنے اور پھولنے کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ اور اس قوم میں قبولیتِ حق کی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے تو آپ نے اس بنجر زمین کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن قوم کی اس نافرمانی و سرکشی اور طغیان پر اُن کا ردِّ عمل اُس سے بالکل مختلف تھا۔ جو ایسے ہی موقع پر ان کے جدِّ اعلیٰ حضرت نوحؑ کا ظاہر ہوا تھا۔ نوحؑ نے اپنی قوم کے متعلق اپنے اللہ سے فریاد کی کہ:۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ○ (نوح: ۲۶)

"اے میرے رب، اس زمین پر کوئی بسنے والا کافر نہ چھوڑ۔"

اس کے برعکس اَوَّاہٌ حَلِیْمٌ ابراہیمؑ فرماتے ہیں۔

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ○ (الصّٰفّٰت: ۹۹)

"اور کہا، میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، میری وہی رہنمائی فرمائے گا۔"

میں نے چاہا تھا کہ یہ قوم اللہ کی بندگی اور اطاعت کی طرف آئے، میں نے اس کے لیے لاکھ کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ اب اگر وہ اُس راہ پر چلنا نہیں چاہتی تو پھر میں اس قوم کو چھوڑ کر اللہ کے دین کے فروغ کے لئے کوئی دوسرا مرکزِ دعوت تلاش کروں گا چونکہ اس ترکِ وطن میں میری کوئی اپنی غرض پنہاں نہیں، بلکہ یہ اللہ ہی کے لئے ہے، تو وہ خود اپنے دین کے لئے میری راہنمائی فرمائے گا۔

یہ ہے وہ یقینِ کامل جو حضرت ابراہیمؑ کو اپنے رب پر تھا۔ بے سروسامانی کے ساتھ، بے یار و مددگار اپنے گھر سے نکل رہے ہیں۔ لیکن دل اس یقین سے سرشار ہے کہ جس رب کے راستے میں وہ یہ ساری صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں، وہ اسے ضائع نہ کرے گا، اور قدر دانی کے طور پر صحیح راہ اور صحیح مقام تک رہنمائی فرمائے گا۔ جس دعوت کو اجاڑنے اور مٹانے کے لئے لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اُس دعوت کو اس سے بہتر مقام اور بہتر طریقے سے فروغ عطا فرمائے گا۔

ہجرت

اب دیکھئے جب اس سفر پر گھر سے نکلتے ہیں، ایک عظیم سفر درپیش ہے۔ نہ منزل کا

کا پتہ ہے اور نہ مستقبل کے امکانات معلوم ، نہ سازو سامان ہے۔ اور نہ ہم سفر رفیقوں کا ہجوم
اگر کوئی زادِ راہ ہے تو وہ صرف توکّل علی اللہ۔ جب حضر میں کوئی ساتھ دینے کے لئے تیار
نہ تھا تو سفر میں ساتھ چلنے کے لئے کون تیار ہوتا؟ اس دشوار گزار، صعوبتوں سے پُر،
انجان منزل، بے کنار ماحول میں ساتھ دینے کے لئے تو وہی تیار ہو سکتا تھا جو اس مشن کو
پوری طرح سمجھتا ہو ، اس کی حقّانیت پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہو ، اور اتنا حوصلہ بھی رکھتا ہو
کہ ہر چہ باداباد ، منزلِ حق تک پہنچنا ہی ہے ، اور اگر نہ پہنچ سکے تو اس ہی راہ میں مرکھپ
جانا ہے ۔

'وہ مبارک ہے جو اس راہ میں کام آیا ہے۔'

چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی ۔ اس ہجرت میں رفاقت کے لئے آپ کو دو عزیز ساتھی میسر
آگئے ۔ ایک تو آپ کے نوجوان مومن بھتیجے لوطؑ اور دوسرے آپ کی زندگی کی رفیق ——
آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ - یہ وہی نوجوان لوط ہیں جنھوں نے بپھری ہوئی قوم اور غضبناک
اقتدار کے علی الرغم اپنے ایمان کا اظہار کیا تھا ۔ اب جب کہ قافلۂ حق ایک نئی منزل کی تلاش میں
رواں دواں ہونے والا تھا ، وہ کیسے پیچھے رہ جاتے ۔ ایک مرتبہ اپنے ہادی و مرشد کا دامن پکڑا
تو زندگی بھر ساتھ نہ چھوڑا ۔ اپنے گھربار ، قبیلہ و قوم ، اور ملک و وطن کو چھوڑ کر اپنے عظیم چچا
کے ساتھ ہو لئے

جس طرح ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود تمام انبیا علیہم السلام کی دعوت ایک
ہی ہے اسی طرح اکثر انبیا علیہم السلام کے احوال و طریق کار میں مماثلت ملتی ہے ۔ خاص
طور پر ایک ہی خانوادے کے دو عظیم افراد —— عظیم دادا اور عظیم پوتے —— ابراہیمؑ اور
محمد رسول اللہ (صلوات اللہ علیہما) میں اخلاق و عادات ، دعوت و مراحل میں جو حیرت انگیز
مماثلت ہے ۔ وہ اس کی قطعی شہادت ہے کہ جس مشن کی ابتدا ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی ۔ اس
کی تکمیل دعائے خلیل کے مجسم ظہور یعنی نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ہوئی ۔ ابراہیم علیہ السلام کے
اس طویل سفر میں لوطؑ رفیقِ سفر تھے تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ بھی ابوبکرؓ
تھے ۔ جس طرح ہجرت سے پہلے ابراہیمؑ کی قوم ان کی جان کے درپے ہوگئی تھی ۔ اسی طرح

ہجرت کی شب مکہ کے خونخوار دشمن آپ کے مکان کے چاروں طرف شمشیر بدست گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ جس طرح ہجرت کے وقت عراق کی سرزمین حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے لئے بنجر ہو گئی تھی، اسی طرح نبی عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کے لئے مکہ کی سرزمین بانجھ ہو گئی تھی جس طرح سیدنا ابراہیمؑ کی دعوت کے لئے فلسطین نے اپنی آغوش وا کی اسی طرح خاتم النبینؐ کے لئے مدینہ طیبہ کی سرزمین سراسر قدم بوس بن گئی۔

اب جب کہ ابراہیمؑ کو رفیقِ سفر مل گیا تھا، اللہ پر توکّل کر کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنے عزم و یقین، اور توکّل و انابت کا یوں اظہار کیا۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (العنکبوت:۲۶)

"پس لوطؑ نے اُن کی بات مانی، اور ابراہیمؑ نے کہا کہ میں اللہ کی راہ میں ہجرت کروں گا۔ بیشک وہ زبردست بھی ہے، اور حکمت والا بھی۔"

یعنی جس اللہ کی خاطر جس اللہ کے راستے میں سفر کر رہا ہوں، وہ ایسی زبردست ذات ہے، کہ اس کی حفاظت میں چلے جانے کے بعد کوئی بڑے سے بڑی طاقت بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور پھر وہ تو حکیم بھی ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ اپنے ارادوں اور اسکیموں کو اس طرح بروئے کار لاتا ہے کہ اس تک کسی کا وہم و گمان بھی نہیں پہنچتا۔

یہ ہجرت جس عزیمت کے ساتھ کی گئی اور جن جذبات کے ساتھ کی گئی، ان کا قرآن مجید میں پورا ذکر آتا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ○ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ

كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ○

(الممتحنۃ: ۴-۶)

"تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا " ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا۔ اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ " مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا (اس سے مستثنیٰ ہے) کہ میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست کروں گا اور اللہ سے آپ کے لئے کچھ حاصل کر لینا میرے بس میں نہیں (اور اصحاب ابراہیم کی دعا یہ تھی کہ) "اے ہمارے رب، تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا، اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے۔ اے ہمارے رب، ہمیں کافروں کے لئے فتنہ نہ بنا دے اور ہمارے رب، ہمارے قصوروں سے درگزر فرما بیشک تو ہی زبردست اور دانا ہے۔ ان ہی لوگوں کے طرز عمل میں تمہارے لئے اور ہر اس شخص کے لئے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور روز آخر کا امیدوار ہو۔ اس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں محمود ہے۔

اس دعا کی معنویت اور مفہوم

اس دعا میں ہمیں بندۂ مومن کا صحیح مقام نظر آتا ہے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی آزمائش کے موقع پر بھی ایک بندۂ مومن کی آخری تمنا کیا ہوتی ہے، اور کس طرح وہ ہر موقع پر اپنے رب ہی سے رجوع کرتا ہے، اور اپنی سب سے بڑی کامیابی و کامرانی اس بات کو سمجھتا ہے کہ اس کے قصور معاف کر دیے جائیں۔

آپ سب سے پہلے اپنے رب پر اپنے توکل و اعتماد کا اظہار کرتے ہیں اور اس طرح اس امداد کے طالب ہوتے ہیں جب سارے خداؤں سے کٹ کر صرف ایک خدا کے ہو رہے

اور اس ہی سے ساری امیدیں وابستہ کریں، تو اب اور کون سا در ہے جس پر جاکر ہاتھ پھیلائے جائیں۔ جب سب سے مڑ کر اس ہی کے در کے ہو رہے اور ایک دن بالآخر اس ہی کے حضور پیش ہونا ہے تو اپنے تمام کاموں کا انجام بھی اس ہی کے سپرد کر دیا۔ وہ ذاتِ پاک خود ہی تمام کاموں کو سنوارے گی اور انجام بخیر کرے گی۔

دوسری بات یہ عرض کی کہ اے ربِ کریم! ہمیں کافروں کے لئے فتنہ نہ بنانا۔ کافروں کے لئے فتنہ بننے کی کئی شکلیں تھیں۔ ایک یہ اگر ہیں ناکام ہو گیا تو کافر اپنی نافرمانی میں اور دلیر ہو جائیں گے، اور اللہ کے نام لیواؤں کے لئے دنیا مزید تنگ ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ کافروں کے ظلم و ستم اتنے بڑھ جائیں کہ اہلِ ایمان کے قدم ڈگمگانے لگیں اور وہ کفار کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں۔ یہ صورت بھی ایسی الم ناک ہوگی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جب روشنی کے مینار ہی بے نور ہو جائیں تو پھر دنیا کہاں سے نورِ ہدایت حاصل کرے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت تک کے لئے بابِ عزیمت بند ہو جائے گا۔ اور اس طرح اہلِ ایمان نہ صرف تباہی کے گڑھے میں گریں گے بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی گمراہی کا سبب بنیں گے۔ تیسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اہلِ کفر کے مقابلہ میں مومنین اتنے مجبور ہو جائیں، کہ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا مقام اور طریق چھوڑ کر وہ تمام حربے استعمال کرنے لگیں جس سے دشمنوں کو نیچا دکھایا جا سکتا ہے، وہ اپنی جگہ کتنے ہی مذموم کیوں نہ ہوں اس طرح اہلِ ایمان خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی دعوت کی بیخ کنی کر دیں۔ آپ نے فتنہ کی تمام شکلوں سے اللہ کی پناہ مانگی۔

تیسری بات یہ عرض کی اے رب! ہمارے قصوروں کو معاف کر دے۔ ہر آزمائش کے موقع پر مومن ڈرتا ہے کہ معلوم نہیں یہ آزمائش کس قصور کی پاداش میں ہے۔ اس لیے وہ ہر ایسے موقع پر اپنی خطاؤں ہی کی بخشش طلب کرتا ہے۔ وہ نہ اپنے قوتِ بازو پر ناز کرتا ہے۔ نہ اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرتا ہے، نہ اپنی عقل و دانش پر بھروسہ کرتا ہے۔ بس اپنے رب کی بخشش پر نظر رکھتا ہے اور وہی طلب کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک بندۂ مومن کا سب سے بڑا سرمایہ اس کے رب کے سامنے تذلل، عجز اور انکسار ہی تو ہے۔ جب خدا اپنے بندے کی یہ

عاجزی دیکھتا ہے تو بے اختیار اپنی رحمت و شفقت کے ساتھ اس پر متوجہ ہوتا ہے ،
اور اس کی ساری مشکلات کو دور فرما دیتا ہے ۔ یہی وہ طریقہ ہے ۔ جو ہر مومن کو اپنا چاہیے
اور اس ہی طریقے کو اللہ تعالیٰ نے اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے
یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اُن اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جن کی بنا پر ابراہیمؑ اور
ان کی قوم اور والد کے درمیان جھگڑا پیدا ہوا تھا ۔
کیا یہ جھگڑا کسی عورت کے پیچھے ہوا تھا کہ ابراہیمؑ اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے
اور قوم و خاندان نے اس کی مزاحمت کی ؟ ہرگز نہیں ۔ ابراہیمؑ جیسی پاک سیرت کے مالک تھے
اس کے پیشِ نظر اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ جس وقت وہ وطن سے نکلے ہیں اس وقت
وہ شادی شدہ تھے ۔ جیسا کہ آیت :-

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ ۝ (الصّٰفّٰت : ۱۰۰)

" اے میرے رب مجھے صالح اولاد عطا فرما "

تو کیا پھر یہ جھگڑا کسی کاروبار ، دھن و دولت کا تھا ، جسے حاصل کرنے کے لئے
ابراہیمؑ تگ و دو کر رہے تھے اور قوم و خاندان کی طرف سے اس کی مزاحمت ہو رہی تھی ۔
——— ہرگز نہیں ۔ اگر ابراہیمؑ ہوسِ زر میں مبتلا ہوتے تو اُن کے لئے بہترین موقع تھا کہ
وہ اپنے باپ کی گدی پر بیٹھتے اور قوم کو نذرانوں اور چڑھاوں کے ذریعے دونوں ہاتھوں
سے لوٹتے ، لیکن ایسا بھی نہ ہوا ۔ انھوں نے تو باپ کی چلتی ہوئی گدی کو خود لات ماری اور
اور اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ۔ تو پھر کیا یہ کسی جائیداد کا جھگڑا تھا ، جس کے حصول
کے لئے اتنی مصیبتیں برداشت کی جا رہی تھیں ؟ یہ بھی نہیں ، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ

فَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ (الصّٰفّٰت : ۹۹)

" میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں ۔ وہ ہی میری رہنمائی فرمائے گا ۔"

کہہ کر سب کو چھوڑ چھاڑ کر ایک نامعلوم منزل کی طرف ہرگز روانہ نہ ہوتے ۔ بلکہ آخر وقت
تک اس بات کی کوشش کرتے کہ کسی طرح تصفیہ کی کوئی صورت نکل آئے اور مطلوبہ
جائیداد مل جائے ۔ لیکن ایسی بھی کوئی بات سامنے نہیں آتی ۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ اقتدار، قوم و خاندان سے ان کا جو جھگڑا تھا وہ خالص نظریاتی بنیادوں پر دین و ایمان کی خاطر ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس دعوت کو لے کر کھڑے ہوئے تھے وہ تمام انبیاء کی دعوتوں کی طرح، زندگی کے ہر گوشہ پر محیط تھی۔ ان کی دعوت کی بنیاد ذات باری کی خالص توحید پر تھی اور اس کی زد ہر اُس شخص پر پڑتی تھی، جو خدا کے سوا کسی اور سے مفادات وابستہ رکھتا تھا۔

دعوتِ ابراہیمی

۱۔ ان کی دعوت کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ اس دنیا اور آسمان کو اور اُن کے درمیان جو کچھ ہے اُن سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ جو تنہا اور ایک ہے۔ اور جب اللہ ہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے تو وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ ربّ العالمین کہلائے اور مانا جائے۔

۲۔ جب اللہ تعالیٰ ہی ربّ العالمین ہے۔ تو پھر وہی اس بات کا حقدار ہے کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور بندگی کی جائے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ رب العالمین کے ہوتے ہوئے اپنی ربوبیت جتائے۔ اور خدا کے بندوں پر اپنی خدائی کا تخت بچھائے۔ اس نکتہ کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ جب اصل صاحب اقتدار، خالق کائنات ہے تو میں ہی جو اس کا مستند نمائندہ ہوں۔ اس بات کا بھی حقدار ہوں۔ کہ زندگی کے تمام معاملات میں میری پیروی و اطاعت کی جائے۔ دعوت کا یہی وہ پہلو ہے جس کی ضرب اقتدارِ وقت نمرود پر پڑی اور وہ بلبلا اٹھا اور اصل خطرہ کو بھانپ کر ابراہیمؑ کو ختم کرنے کے درپے ہو گیا۔

۳۔ ان کی دعوت کا تیسرا نکتہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو ربّ العالمین ہے وہ اپنی ذات و صفات اور اختیارات میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ یہ تم نے جو سینکڑوں معبود بنا رکھے ہیں، کہیں چاند سورج، ستارے پوجتے ہو، کہیں اپنے ہی ہاتھوں سے گھڑے ہوئے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہو۔ یہ سب بے اصل اور بے اختیار ہیں۔ تم اگر ان کو نہیں چھوڑتے تو میں برسرِ عام اعلان کرتا ہوں کہ میں ان سب سے بیزار ہوں اور تمہارے اس جرم شرک سے بَری ہوں۔

۴۔ ان کی دعوت کا چوتھا نکتہ یہ تھا کہ ہر شخص فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ

ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہر شخص سے اس کے کئے کا حساب لیا جائے گا۔ اس دن انسان کو اللہ کی پکڑ سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی۔ اس دن جو شخص ایمانِ خالص، اعمالِ صالحہ اور قلبِ سلیم لے کر اللہ کے یہاں حاضر ہوگا وہی کامیاب و سرخرو ہوگا۔ رہے وہ لوگ جو خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں، وہ سب اپنے معبودانِ باطل سمیت ذلیل و رسوا ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے اور اُس سزا سے نہ بچ سکیں گے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مجرموں کے لئے مقرر کی ہے۔

اُس دعوت کو نہایت خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ حسبِ ذیل حصے میں بیان کیا گیا ہے۔

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ﴿٣٦﴾ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ۝ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۝ وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ۝ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ ۝ وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ ۝ وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ۝ مِنْ نُطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ۝ وَأَنَّ عَلَيْهِ النَّشْأَةَ الْأُخْرَىٰ ۝ وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ وَأَقْنَىٰ ۝ وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشِّعْرَىٰ ۝ وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ ۝ وَثَمُودَ فَمَا أَبْقَىٰ ۝ وَقَوْمَ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَىٰ ۝ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ ۝ فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارَىٰ ﴿٥٥﴾

(النجم: ۳۶-۵۵)

"کیا اُسے اُن باتوں کی کوئی خبر نہ پہنچی۔ جو موسیٰ کے صحیفوں اور ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں، جس نے وفا کا حق ادا کر دیا؟

"یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے، مگر وہ جس کی اُس نے سعی کی ہے۔

اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی اور اُس کی پوری جزا اسے دی جائے گی۔

اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے،
اور یہ کہ اُسی نے ہنسایا، اور اُسی نے رُلایا۔
اور یہ کہ اُسی نے موت دی اور اُسی نے زندگی بخشی۔
اور یہ کہ اُس نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔
اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اُسی کے ذمہ ہے۔
اور یہ کہ اُس نے غنی کیا اور جائیداد بخشی۔
اور یہ کہ وہی شعریٰ کا رب ہے،
اور یہ کہ اسی نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا اور ثمود کو ایسا مٹایا کہ ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا۔
اور اُن سے پہلے قوم نوح کو تباہ کیا۔ کیونکہ وہ تھے ہی سخت ظالم اور سرکش لوگ،
اور اوندھی گرنے والی بستیوں کو اٹھا پھینکا، پھر چھا دیا ان پر وہ کچھ جو (تم جانتے ہی ہو۔ کہ) کیا چھا دیا۔
پس اے مخاطب، اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں تو شک کرے گا"

دوسری جگہ اس دعوت کا اجمالی تعارف یوں کرایا گیا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ۝

(الاعلیٰ: ۱۴-۱۹)

"فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر ہے۔ اور باقی رہنے والی ہے۔ یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔"

ان آیات میں نہ صرف یہ کہ ابراہیمؑ کی پوری دعوت کو نہایت وضاحت اور دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے بلکہ اس سے انکار کرنے والوں کا انجام بھی نہایت صراحت کے ساتھ

بیان کردیا ہے ۔ زندگی کے جس جس پہلو میں جس جس راستے سے شرک در آتا ہے ۔ ان سب کی نشاندہی کی اور بدلائل ان کا رد بھی کیا ۔ اور منکرین کو متنبہ بھی کردیا کہ اگر انھوں نے اس دعوت کی مخالفت ترک نہ کی تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو اس سے پہلے دوسری قوموں قوم نوح ، عاد ، ثمود کا ہوا ہے ؛ حالانکہ طاقت وشکوہ اور اپنے طنطنے کے لحاظ سے وہ ان سے کہیں زیادہ طاقتور قومیں تھیں ۔

فکرِ آخرت

توحید و رسالت کے بعد اس دعوت کا ایک اور بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے ؛ اور وہ ہے یقینِ آخرت ، فکرِ آخرت اور ترجیحِ آخرت ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس راہ میں کوئی شخص دو قدم بھی نہیں چل سکتا ، اگر اسے یہ یقین حاصل نہ ہو کہ ایک دن مجھے مرنا ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا ہے ، اس دن میرے تمام کاموں کا حساب لیا جائے گا ۔ اگر اچھے کام کیے ہیں تو جزا ملے گی ورنہ سزا ۔ یہی جزا و سزا کا دھڑکا اسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ دارِ آخرت کی فکر کرے ، اور اس دن سرخرو ہونے کی سعی کرے ۔ اگر اس نے موجودہ مہلتِ عمل ——— دنیاوی زندگی ——— صرف کھیل کود میں گزار دی اور فکرِ آخرت سے بے نیاز رہا تو پھر اس کا انجام دیکھ لے گا ۔ اور اس انجام سے جو یقیناً ہولناک ہوگا ۔ اسے کوئی نہ بچا سکے گا ۔ یہی فکرِ آخرت ہے جو اسے اس بات پر تیار کرتی ہے کہ وہ ترجیحِ آخرت اختیار کرے ۔ یہ دنیا اس کی بنے یا بگڑے ، برباد ہو یا آباد ہو ۔ اس کو وہی پہلو اختیار کرنا ہے جو اسے آخرت میں اچھے انجام تک پہنچائے ۔

ابراہیم علیہ السلام نے ترجیحِ آخرت کا جو شاندار مظاہرہ کیا وہ اُن کے ایک ایک قدم سے ظاہر ہوتا تھا ۔ انھوں نے آخرت بنانے کے لئے اپنی قوم و خاندان سے مخالفت مول لی ، ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کیں حتی کہ آگ میں جل جانے کے لئے تیار ہوگئے ، لیکن اپنی آخرت بگاڑنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکے ۔ ان کے اس ہی شاندار کارنامے نے انھیں اس بات کا مستحق بنا دیا کہ دربارِ خداوندی سے انھیں " اِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفّٰى " ابراہیم وفادار (جس نے وفاداری کا حق ادا کردیا) کا خطاب ملا ۔ اور ان کی اس روش کو امتِ مسلمہ کے لئے اسوۂ

حسنہ" قرار دیا گیا۔

مشرکین سے اعلانِ برأت

اس اسوۂ حسنہ میں ان کا وہ مشہور اعلان برأت شامل ہے۔ جو انھوں نے اپنی پوری قوم کے سامنے کیا تھا۔ آپ نے نہ صرف قوم کے تمام مشرکانہ کاموں سے تبرّی کیا بلکہ اپنے بے لچک اور غیر مصالحانہ رویے کا بھی پوری قوت کے ساتھ اعلان کرتے ہوئے کہا:

وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗٓ ○ (الممتحنہ:۴)

ہمارے اور تمہارے درمیان اس وقت تک بغض و عداوت رہے گا جب تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ گے۔"

اس دو ٹوک، جرأت مندانہ اور بے باکانہ اعلان کے بعد بھی اگر آپ کی قوم آپ کو برداشت کرتی تو ضرور تعجب انگیز ہوتا۔ دراصل حق کی شان ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ باطل کے لئے ناقابل برداشت بن جائے۔ اُس حق کے "حق" ہونے میں شک ہے جو نہ صرف یہ کہ باطل کے لئے قابل برداشت ہو، بلکہ اس کے لئے اپنے مناصب کے دروازے بھی کھول دے، اور اُن "متقی اہل حق" کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے۔

ان کی اس کمال درجہ کی جرأت، وفاداری اور قربانی کا اللہ تعالیٰ نے یہ صلہ دیا کہ آپ کو اس بدقماش اور ظالم قوم سے نجات دے کر ایک ایسی جگہ پہنچا یا جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے ہر قسم کی برکات مہیا کر رکھی تھیں۔

وَنَجَّیْنٰہُ وَلُوْطًا اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء:۷۱)

"اور ہم اسے اور لوط کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لئے برکتیں رکھی ہیں"

یہ برکتوں والی سرزمین ارضِ شام و فلسطین ہے جو دنیاوی نعمتوں سے بھی مالا مال تھی اور روحانی نعمتوں سے بھی۔ زمین سرسبز و زرخیز اور ہزاروں سال سے انبیاء علیہ السلام اور ان کی دعوتوں کی امین۔ خدا کے برگزیدہ رسول جتنی کثرت کے ساتھ یہاں مبعوث ہوئے کہیں

اور نہیں ہوئے بحسبِ ذیل آیات میں قرآن مجید نے اس ہی سرزمین کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

○ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ (الاعراف: ۱۳۷)

" اور اُن کی جگہ ہم نے اُن لوگوں کو جو کمزور بنا رکھے گئے تھے ، اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا ۔ جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا ۔"

○ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ (الاسراء: ۱)

" پاک ہے وہ جو لے گیا ، ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے ، تاکہ اُسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے ۔"

○ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ (الانبیاء: ۸۱)

" اور سلیمان کے لئے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اُس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں ۔"

○ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ (سبا: ۱۸)

" اور ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں کے درمیان ، جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی ، نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور اُن میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں ۔"

یہیں سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ابراہیم ؑ نے جب عراق کی سرزمین کو ترک کیا تو آ فلسطین ہی تشریف لے گئے ۔

صالح اولاد کی درخواست

آپ جب گھر سے روانہ ہوئے تو خدا کی اس بستی میں سے آپ کے ساتھ صرف دو فرد نکلے۔ ایک آپ کی اہلیہ حضرت سارہ اور دوسرے آپ کے بھتیجے حضرت لوطؑ ۔ آپ گھر بار کو چھوڑتے ہیں، خاندان اور قوم کو چھوڑتے ہیں، ملک و وطن کو چھوڑتے ہیں، لیکن آپ کو کسی چیز کی نہ فکر ہے اور نہ پرواہ۔ اگر فکر ہے تو صرف یہ کہ یہ دعوت جس کے لئے یہ ساری قربانیاں دیں، کیسے پھلے پھولے گی، اور کیسے جاری رہے گی۔ جب اپنی تنہائی دیکھی تو بے قرار ہو کر رب العالمین سے دعا کی۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ ۝

"اے پروردگار، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔"

دوسری جگہ آتا ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ مزید درخواست بھی کی کہ

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ ۝ (الشعرآء: ۸۳)

"اے میرے رب مجھے حکم عطا فرما اور صالحوں سے مجھے ملا۔"

غور کرنے کا مقام ہے کہ اب صرف بیٹا طلب نہیں کرتے بلکہ صالح بیٹا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس مشن کو جاری رکھ سکے جس کے لئے ابراہیمؑ نے یہ ساری صعوبتیں برداشت کی تھیں، اور اس کے ساتھ ہی عرض کیا کہ مجھے 'حکم' بھی عطا فرما۔ یعنی وہ حکمت بھی اور طاقت بھی جو اس کو فروغ دینے کے لئے اور کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے درکار ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ عظیم الشان کام انجام دینا کسی ایک شخص کے بس کا کام نہیں ہے، اس لئے عرض کیا کہ اس کام کے لئے مجھے صالحین کی ایک جماعت بھی عطا فرما جو اس کام کو حکمت کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور بشارت دی۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيمٍ ۝ (الصّٰفّٰت: ۱۰۱)

"پس ہم نے اس کو ایک (بردبار) حلیم لڑکے کی بشارت دی۔"

یہ بشارت کب دی گئی، اس کی قبولیت کا ظہور کس طرح ہوا اور اس کے الفاظ "غلام حلیم" کی صداقت کس طرح ہوئی، اس کو آئندہ واقعات ثابت کریں گے۔

سچی ناموری کی درخواست

عطائے فرزند کی درخواست کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنی دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لئے دعا مانگی۔ اور اپنے وعدہ کے ایفاء میں اپنے والد کی مغفرت کے لئے بھی دعا کی۔ عرض کیا:

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِيْنَ ۝ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝ وَاغْفِرْ لِأَبِيْ إِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّالِّيْنَ ۝ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ (الشعراء: ۸۴-۸۹)

"اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر، اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما، اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بیشک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور مجھے اُس دن رسوا نہ کر جب کہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ جب کہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد۔ بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔"

اس دعا میں مومن کے ایک سچے دل کی تڑپ ہے، خدا کے دربار میں عرض کرنے کے آداب ہیں اور ان تمام باتوں کی نشاندہی بھی جن کی ایک مومن کو طلب ہونی چاہئے۔

پہلی چیز جو آپ نے اپنے رب سے طلب کی وہ سچی ناموری ہے

ناموری کی ایک قسم یہ ہے کہ آدمی نے کام تو کوئی اچھا کیا نہیں، لیکن چاہتا ہے کہ لوگ اسے ان تمام خوبیوں سے متصف کریں جن سے وہ عاری ہے، اور بن کئے اپنے کھاتے میں تعریفیں ڈلوانا چاہتا ہے۔ بغیر استحقاق کے اپنی تعریفوں کے پل بندھوانے کی خواہش کرنا سچی ناموری نہیں، بلکہ ایسی جھوٹی ناموری ہے۔ جس کی اللہ تعالیٰ نے یوں مذمت فرمائی:

وَيُحِبُّوْنَ أَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ۝ (آل عمران: ۱۸۸)

"اور وہ پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں پر کی جائے، جو انھوں نے نہیں

نے نہیں کئے۔ انھیں عذاب سے بچ نکلنے والا نہ سمجھو، بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

دوسری ناموری وہ ہے جس کے تحت ایک آدمی کوئی اچھا کام کرتا بھی ہے۔ تو صرف اس اس لئے کہ دنیا میں اس کا کسی طرح نام ہو جائے اور بس، آخرت میں خواہ اس کا کچھ نتیجہ نکلے یا نہ نکلے۔ ایسے شخص کو آخرت کا یقین ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی ہے تو ایسا نہیں کہ اس کی بنا پر وہ اپنی شہرت و ناموری سے بے نیاز ہو جائے۔ ایسی ناموری کی خواہش کو اللہ نے ریا قرار دیا ہے۔

وَالَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ (النساء : ۳۸)

"اور جو لوگ اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور نہ یوم آخرت پر"

ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ آخرت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں۔

وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ج وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ط وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (آل عمران : ۱۴۵)

"جو دنیا کا ثواب چاہتا ہے۔ تو ہم اُسے وہی دیتے ہیں اور جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے۔ تو ہم اُسے بھی وہی دیتے ہیں۔ اور ہم شکر کرنے والوں کو ضرور جزا دیں گے۔"

ان کے برعکس ایک تیسری ناموری وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے اُن بندوں کو عطا کرتا ہے جو نیکی محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ کا حکم ہے اور اللہ ہی نے اس پر اجر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ اس کام کو محض اللہ کے حکم کی تعمیل میں انجام دیتے ہیں قطع نظر اس کے کہ اس نیکی کو کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، یا کوئی اس کی تعریف کرے یا نہ کرے جس کی ایک مثال قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا

نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا ○ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ○ (الدھر: ۸-۹)

"اور وہ محض اس کی محبت میں مسکین اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمہیں جو یہ کھانا کھلا رہے ہیں یہ محض خدا کی خوشنودی کی خاطر کھلا رہے ہیں، اس پر نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ قدر دانی۔ بے شک ہم اپنے رب سے اس دن کے بارے میں ڈرتے ہیں جس دن لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے۔"

یہ لِوَجْہِ اللّٰہ نیکی کرنے والے اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے دعا کریں کہ۔

وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○ (الفرقان: ۷۴)

"اور ہم کو متقین کا امام بنا۔"

یعنی ہمیں نیکی کی اتنی توفیق دے کہ اس میں ہم کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ بلکہ نیکی کرنے میں سب سے سبقت لے جائیں، اور اس کی بنا پر امام الاتقیاء بن سکیں۔ یہی وہ محمود طلب ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے قدر کی ہے، اور یہی وہ طلب تھی جو ابراہیم نے کی تھی۔

جنت کی خواہش

دوسری چیز جس کے لئے آپ نے خواہش ظاہر کی نعمتیں بھری جنت ہے۔ یہ ایک صوفیانہ نکتہ تو ہو سکتا ہے کہ جنت طلب کرنے کی چیز نہیں، بلکہ خدا کا انعام ہے۔ اس لئے صرف رضائے الٰہی کی طلب کرنا چاہیے، جنت کی نہیں؛ کیونکہ اس سے بندگی میں خواہش جنت کی لاگ آجائے گی اور خالص رضائے الٰہی کی طلب مشکوک ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسی نکتہ طرازی ہے جس کے لئے خدا کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔ ایک طرح کی ناشکری ہے۔ جب دینے والا خود فرماتا ہے کہ مجھ سے مانگو اور یہ یہ چیزیں مانگو، تو بڑا ہی بدنصیب ہے وہ شخص جو دینے والے کی ہدایت کے باوجود نہ مانگے۔ یا تو وہ اپنے آپ کو دینے والے سے بھی زیادہ بے نیاز سمجھتا ہے اور یہ کھلا غرور ہے۔ یا وہ اس چیز کو حقیر سمجھتا ہے جسے دینے والا بطور انعام دینے کا وعدہ کرتا ہے اور اس کو مانگنے کے اسلوب بتاتا ہے، تو یہ کھلا کھلا کفرانِ نعمت ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بتاتا ہے:

وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ (البقرۃ ۵: ۲۲۱)

"اور اللہ جنت کی طرف پکارتا ہے، اور مغفرت کی طرف اپنے اذن سے"

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حٰمٓ السجدۃ ۳۰:۵)

"اور جنت کی بشارت دو، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (الصف: ۱۲)

"اور وہ تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔"

اس سے زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ حسب ذیل آیت میں جنت طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

"اور دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔"

اب اگر کوئی اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ تقویٰ کی حقیقت جانتا ہے تو اس کو اپنی دماغی حالت کے متعلق خود سوچنا چاہیئے کہ وہ اپنے لئے کس مقام کا مدعی ہے۔

اس کے بعد آپ یوم قیامت پر رسوائی و ذلت سے پناہ مانگتے ہیں۔ آپ اس خیال سے کانپ اٹھتے ہیں کہ ایک طرف میں خدا کا فرستادہ، رسول اور نبی ہوں جس کے سپرد ایک عالم کو راہ ہدایت دکھانا ہے، تو دوسری طرف اسی ہادی و مرشد کا باپ جو بت پرستوں کا سرخیل ہے دوزخ کی طرف ہانکا جا رہا ہے۔ اپنے باپ کے اس عبرت ناک انجام سے خوف زدہ ہو کر اپنی فطرت رحمت و رافت اور اپنے اس وعدہ کا پاس کرتے ہوئے جو آپ نے اپنے والد سے کیا تھا خدا سے عرض کیا کہ رب العالمین اس کی ساری گمراہیوں کے باوجود اس کو بخش دے۔

ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرتے جاتے ہیں۔ کہ اس دن کوئی رشتہ ناتہ کام نہ آئے گا اور کوئی بیٹا اپنے باپ کو نہ بخشوا سکے گا، یہ بخشش تو سراسر عطیۂ الٰہی ہوگی، اس دن تو صرف نیک اعمال ہی کام آسکیں گے۔

رب العالمین نے ان کی یہ دعائیں سنیں۔ پہلی دو دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا۔ آپ کو وہ سچی ناموری عطا کی کہ آج چار ہزار سال گزر گئے، مگر ابھی تک کروڑوں انسان ان کو اپنا ہادی وامام مانتے ہیں اور درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اولاد عطا کی تو ایسی کہ نسلاً بعد نسل نبوت کی امین رہی اور اس پر ہی نبوت ختم ہوگئی۔ رہتی دنیا تک کے لئے اس کو اسوۂ حسنہ بنا دیا۔

جنت کا ایسا وارث بنایا کہ نہ صرف خود جنت میں جائیں گے۔ بلکہ اپنے ساتھ کروڑوں انسانوں کو بھی جنت کا مستحق بنا دیا جنھوں نے آپ کی پیروی اختیار کی۔ اللہ اللہ کیا مقام عطا کیا کہ؎

عروجِ بندۂ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

تیسری دعا مغفرتِ والد کے بارے میں اس وقت فیصلہ محفوظ رکھا اور اس کے متعلق آئندہ فیصلہ صادر فرمایا۔

دعوت کے نئے مرکز کی تلاش

اب ابراہیمؑ سرزمین عراق کو چھوڑ کر وحیِ الٰہی کے اشارہ کے مطابق اردن، شام اور فلسطین کی طرف روانہ ہوئے (الانبیاء: ۷۱)

کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے اور وہاں کچھ عرصے تک قیام کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کا یہ سفر تلاشِ معاش یا امکاناتِ روزگار کا جائزہ لینے کے لئے نہ تھا کہ جہاں جاتے وہاں اپنی تجارتی کوٹھیاں بناتے۔ آپ نے تو اپنا گھر بار، ملک، وطن چھوڑا ہی اس لئے تھا کہ یہاں خدا کا کلمہ بلند کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی اور اب اس ہی پیغامِ ربانی کو پہنچانے اور دعوت کے لئے ایک مستقر تلاش کرنے کے لئے نکلے تھے جہاں سے قیامت تک کے لئے ہدایتِ ربانی کی کرنیں پھوٹیں اور اپنی ضیا پاشیوں سے ایک عالم کو منور کردیں۔ وہ مستقر ایک ایسے مرکزی مقام پر ہے جہاں ہر جگہ سے اور ہر موسم میں لوگ پہنچ سکیں، اور انوارِ الٰہی سے فیض یاب ہوسکیں۔

اب ظاہر ہے کہ مصر میں قیام کے دوران آپ نے اپنی دعوت پھیلائی ہوگی اور وہاں کے

لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا ہوگا یہی تو آپ کی زندگی کا مشن تھا، اور ایک نبی کی حیثیت سے آپ اُس سے کیسے غافل رہ سکتے تھے۔ عراق کے برعکس، مصر کے قیام میں وہاں کا بادشاہ آپ کی اعلیٰ سیرت، بلند اخلاق اور پاکیزہ دعوت سے متاثر ہوا۔ یہ تو کہنا مشکل ہے کہ وہ آپ پر ایمان لایا یا نہیں، لیکن مصر سے آپ کی واپسی کے وقت اس نے آپ کے ساتھ جو کریمانہ سلوک کیا وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ واپسی پر اُس نے جہاں بہت سے تحفے تحائف دئے وہاں حضرت ہاجرہ کو بھی آپ کی خدمت میں پیش کیا اور آپ کی نذر کر دیا۔

پیدائشِ اسماعیلؑ اور آبادی مکہ

اب وہ وقت آگیا تھا کہ آپ کے اس طویل سفر کا پہلا مرحلہ ختم ہو۔ آپ مشیت خداوندی اور وحیٔ الٰہی کی روشنی میں اپنے اہل و عیال کو لے کر سوئے حجاز روانہ ہوئے راستے میں سرزمین کنعان میں کچھ عرصہ قیام کیا، جہاں حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ یہ اُس دعائے خلیل کی قبولیت کی واضح نشانی تھی۔ جو آپ نے عراق سے روانہ ہوتے ہوئے کی تھی کہ،

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت: ۱۰۰)

"اے میرے ربّ، مجھے صالح اولاد عنایت فرما۔"

اس دعا کی قبولیت کا اثر کتنے عرصے کے بعد ظاہر ہوا، یہ بھی ہمیں قرآن مجید ہی بتاتا ہے۔ ابراہیمؑ جب عراق سے ہجرت کے لئے نکلے تو نوجوان تھے اور جب یہ بیٹا ہوا تو بڑھاپے کی منزلوں میں تھے۔ چنانچہ آپ نے خود فرمایا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ (ابرٰهیم: ۳۹)

"اس خدا کا شکر ہے کہ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحاق دیئے۔ بیشک میرا رب دعا سننے والا ہے۔"

تاریخ و بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے وقت آپ کی عمر تقریباً ۸۶ سال کی تھی یعنی تقریباً ۵۰ سال کے بعد قبولیت دعا کے اثرات ظاہر ہوئے۔ یہ مقام ان تمام لوگوں کے لئے دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ جو خدائے تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں

اور چاہتے ہیں کہ درشنی ہنڈی (BEARER CHEQUE) کی طرح ادھر دعا مانگیں اور ادھر قبول ہو کر اس کا صلہ مل جائے۔ جب دیکھتے ہیں کہ دعا کی قبولیت کے آثار نظر نہیں آتے تو اپنے خدا سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ جب ایسے جلیل القدر نبی کی دعا کے ظہور میں آنے میں ۵۰ سال لگ سکتے ہیں تو دوسرے لوگ کس شمار و قطار میں ہیں یہ تو دینے والا ہی جانتا ہے کہ کسی شخص کو کب اور کیا دے۔ مانگنے والا اگر یہ سمجھنے لگے کہ میں جب مانگ رہا ہوں تو اسی وقت مل جائے اور جو کچھ مانگ رہا ہوں، وہی مل جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہی اپنے آپ کو "سمیع الدعا" سمجھتا ہے۔ مانگنے والے کا تو بس اتنا ہی کام ہے کہ اپنی طلب بیان کر دے اور اس بات کو دینے والے کی صوابدید پر چھوڑ دے کہ وہ کب دیتا ہے اور کیسے دیتا ہے یہی مقام بندگی ہے۔ اگر ہم دعا اور اس کی اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو ہم بھی حضرت خلیلؑ کی طرح کبھی مایوس نہ ہوں، اور ان برکات و عطیات کے مستحق بنیں جو اللہ اپنے صابر و شکر گزار بندوں کو عطا کرتا ہے۔

ایک نئی آزمائش

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی ایک عجیب سنت ہے کہ جب وہ کسی بندۂ مومن کو اپنی نعمت سے نوازتا ہے۔ تو ساتھ اس کی آزمائش بھی کر دیتا ہے۔

جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے

جس کا مقام جتنا زیادہ بلند ہوتا ہے۔ اس کے لئے اتنی ہی زیادہ آزمائشیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے تو صادق و مصدوق علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا۔

"اس زمین پر سب سے زیادہ آزمائش انبیاء ؑ کی ہوتی ہے"

اور ابراہیم ؑ کی تو زندگی عبارت ہی آزمائشوں سے تھی، اور کیوں نہ ہوتی آخر انھیں امام الناس بنانا تھا۔ ان کی زندگی کے اس ہی پہلو کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (البقرۃ : ۱۲۴)

"اور ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا۔ پس جب وہ ان میں پورا اترا تو فرمایا: میں تجھ کو انسانوں کا امام بنا دوں گا۔"

پہلی آزمائش اس وقت کی گئی۔ جب آپ کو نبوت سے سرفراز کیا۔ پوری قوم دشمن ہو گئی، اقتدار دشمن ہو گیا، حتیٰ کہ باپ تک دشمن ہو گیا اور سب نے مل کر آپ کو آگ میں ڈال دیا، لیکن اس خدا کے بندے کی جبیں پر بل نہ آیا، بلکہ کہا تو یہی کہا کہ

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران : ۱۷۳)

"ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے اور وہ سب سے بہتر کارساز ہے۔"

آگ سے بچانے کا جو عظیم انعام کیا گیا، اس کے بعد اب ایک نئی آزمائش آنا ہی تھی۔

ہجرت کا حکم ملا اور گھر بار، خاندان، اور ملک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے دو رفیقوں کے ہمراہ چل پڑے۔ ملکوں ملکوں کی خاک چھانی، اردن، شام، فلسطین، مصر گئے۔ اب جو حکم ملا کہ جوف الارض (زمین کی ناف) ابھی خالی پڑی ہے۔ وہاں جاؤ۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ (الحج: ۲۶)

"یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیئے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی۔"

بس اب کیا تھا، ان کی تو زندگی کی نہج ہی یہ تھی کہ جب بھی آقا کا اشارہ ہو اس کی فوراً تعمیل کی جائے۔ چنانچہ نومود بچے اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ ہاجرہؑ کو لے کر سوئے حجاز روانہ ہو گئے۔ اور بالآخر اس جگہ پہنچ گئے جہاں اب بیت اللہ ہے۔ لیکن یہ آزمائش کا اختتام نہ تھا، ابھی تو ابتدا ہوئی تھی۔ اشارہ ہوا کہ اس بچے اور اس کی ماں کو یہیں چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اندازہ لگائیے کہ یہ کتنی بڑی اور سخت آزمائش تھی۔ تقریباً ۸۰ سال کے انتظار کے بعد بڑھاپے میں لڑکا پیدا ہوتا ہے، ماں باپ کے دل میں کتنی آرزوئیں اور کتنے ارمان ہوں گے۔ کوئی دوسری اولاد بھی نہیں۔ اور نہ اس کے کوئی آثار۔ پہلی بیوی بوڑھی اور بانجھ۔ دل پر جو بھی گزر جاتی، وہ کم تھا، لیکن ابراہیمؑ تو کچھ دوسری ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے لئے تو کوئی آزمائش اور کوئی ابتلا بڑی ہی نہ تھی۔ بھلا جس نے طے کر لیا ہو کہ مجھے اپنے مالک کو ہر حال میں راضی کرنا ہے۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہے، چاہے اس کی کتنی ہی قیمت ادا کرنا پڑے تو اس کے لئے کوئی بھی حکم مشکل نہ تھا۔ انھوں نے فوراً ہی سر تسلیم خم کیا اور تعمیل حکم شروع کر دی۔ ایک مشکیزہ پانی کا بھرا، ایک تھیلے میں کچھ کھجوریں رکھیں اور اس سنسان وادی میں جہاں دور دور تک نہ آدم نہ آدم زاد، ہو کا عالم، ایک درخت کے نیچے (جہاں اب چاہِ زمزم ہے) ماں اور بیٹے کو چھوڑا، خدا حافظ کہا۔ اور تنہا واپس روانہ ہو گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت ہاجرہ اس واقعہ کے پس منظر سے ناواقف تھیں۔ بڑی حیران ہوئیں کہ یہ کیا ماجرہ ہے؟ ایک طویل عرصے کی دعاؤں کے بعد اس بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے یہ چاند سا بیٹا عطا کیا۔ فطری طور پر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس لختِ جگر کو ایک منٹ کے لئے بھی جدا نہ کرتے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہم دونوں ماں بیٹے

کو ایک لق و دق صحرا میں جہاں نہ کھانے پینے کو کچھ ہے اور نہ کوئی آبادی، بے یار و مددگار اور یکہ و تنہا چھوڑے جا رہے ہیں! اس اضطراب میں آپ حضرت ابراہیمؑ کے پیچھے کچھ دور تک دوڑیں اور پکار پکار کر کہا کہ ہمیں اس بے آب و گیاہ وادی میں کہاں اور کس لئے چھوڑے جا رہے ہیں۔

لیکن ابراہیمؑ نے نہ پلٹ کر دیکھا اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ سوچتے ہوں گے کہ میں ایک کمزور انسان ہوں۔ اگر پلٹ کر دیکھا یا سمجھانے کی خاطر جواب دیا، اور گفتگو کی تو مبادا جذبات سے مغلوب ہو جاؤں، اور پائے استقامت میں لرزش آجائے" اور یوں خدائے پاک کی اطاعت و فرماں برداری میں نقص واقع ہو جائے۔ اللہ اللہ! کیا شان بندگی تھی کہ خیال میں بھی لغزش آجانے سے پرہیز۔ چپ چاپ اپنے راستے پر چلتے گئے۔

حضرت ہاجرہؑ کے لئے حضرت ابراہیمؑ کوئی نئے آدمی نہ تھے کہ وہ ان کی سیرت و کردار سے واقف نہ ہوں۔ آخر اپنی زندگی کا بہترین حصہ ان کے ساتھ گزار چکی تھیں۔ جس شخص کے متعلق خود اللہ یہ گواہی دے کہ

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ○

"بے شک ابراہیم رقیق القلب اور بردبار تھا۔"

اس کے متعلق یہ کون سوچ سکتا تھا کہ وہ کبھی سنگدلی کا بھی مظاہرہ کرے گا۔ چنانچہ حضرت ہاجرہ نے یہ نہیں سمجھا کہ یہ کوئی سنگدلی یا شقاوت قلبی ہے۔ جو شخص اپنے خون کے پیاسے، اپنے جانی دشمن، باپ کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرے۔ وہ اپنی اولاد، وہ بھی بڑھاپے کی پہلوٹی اولاد، وہ بھی لڑکی نہیں لڑکا، اور جو برسوں کی دعا کے بعد ملا ہو، اس کے لئے کیسے سنگدل ہو سکتا تھا؟ انھوں نے سوچا کہ یہ عجیب رویہ ضرور کسی ہدایت ربانی کے تحت اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے از خود ہی کہا:

"کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔"

ابراہیمؑ نے بغیر مڑے جواب دیا۔ "ہاں"

حضرت ہاجرہ تھیں تو بہر حال نبی کی بیوی، عمر کا ایک حصہ ان کے ساتھ گزارا تھا۔ اطاعتِ الٰہی کے سیکڑوں نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں گے۔ حکم الٰہی کی تعمیل میں ان کا والہانہ شوق

ہر روز ان کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ فوراً ہی بات کی تہہ کو پہنچ گئیں اور بولیں :

"اگر یہ بات ہے ۔ تو اللہ ہمیں ضائع نہ کرے گا۔"

آخر جس گھرانے پر دن رات اللہ کی رحمتیں اور برکات نازل ہوتی ہوں وہ یکایک کیسے اللہ کے غضب کا نشانہ بن جائے گا۔ راضی برضا ہو کر واپس پلٹ آئیں اور اپنے بیٹے کے پاس بیٹھ گئیں۔

ادھر ابراہیمؑ اپنے راستے پر چلتے گئے۔ انھوں نے جب محسوس کیا کہ حضرت ہاجرہؑ واپس چلی گئیں اور اب ماں بیٹے آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور جذبات سے مغلوب ہونے کا خطرہ ٹل چکا ہے۔ تو ایک پہاڑی کے دامن میں ٹھہرے ۔ بیت اللہ کے لئے مقررہ مقام کی طرف رخ کیا۔ اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے رب سے گزارش کی :

دعائے ابراہیم

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ ○ (ابراہیم : ۳۷)

"اے ہمارے رب، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار، یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور کھانے کو پھل دے ۔ شاید کہ یہ شکر گزار بنیں ۔"

یہ ایک دکھی مگر صابر و شاکر دل کی پکار تھی جو رب کریم کے سامنے پیش کی گئی تھی ، لیکن اس دعا میں بھی پیغمبرانہ شان جھلک رہی تھی۔ اس موقع پر اگر کوئی عام آدمی دعا مانگتا تو اپنے بچے کی سلامتی کے لئے دعا کرتا۔ اس کے لئے بلند مناصب کی التجا کرتا۔ اس کی ناموری اور دنیاوی شان و شوکت کی خواہش کرتا۔ لیکن پیغمبر تو عام انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ دعا مانگتے ہیں۔ تو کیا؟ کہ اس سنسان اور بنجر زمین میں اپنے لخت جگر اور رفیقہ حیات کو اس لئے چھوڑ رہا ہوں کہ تیری بندگی کا نشان ــــــ نماز ـــــ قائم ہو۔ جس بت پرستی

سے بھاگ کر آیا ہوں اُس سے میری اولاد کو بچا۔ اور اس کی جگہ اس کی پیٹھ کاٹنے والی نماز کو قائم کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کی سیرت و کردار، ان کے اخلاق و اطوار، ان کی شخصیت اور دعوت کو ایسا پُرکشش بنا کہ لوگوں کے دل ان کے گرویدہ اور مشتاق ہو جائیں۔ اور اس بنجر زمین میں کہ جہاں نہ کھیت ہیں، نہ باغات، اس میں بسنے والوں کو پھلوں کا رزق دے تاکہ لوگ تیری قدرت کی نشانیاں دیکھیں اور تیرا شکر بجالائیں کہ اس بے آب و گیاہ زمین میں تو نے کیا کیا نعمتیں عطا کی ہیں۔

واقعی یہ پیغمبرانہ بصیرت تھی جو دیکھ رہی تھی کہ اس بستی میں رہنے والوں کے لئے ایسی کیا چیز ہونا چاہئے جو انھیں شکر بجالانے پر مجبور کر دے، اور انھوں نے اس ہی کے لئے دعا کی۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی قبولیت آج چار ہزار سال بعد بھی دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ جس ذوق و شوق سے آج بھی طواف کرنے والے دن رات کے ہر حصے میں بیت اللہ کو معمور رکھتے ہیں وہ اس دعا کی مقبولیت کا کھلا ثبوت ہے۔ آج دنیا کے ہر حصے سے بہترین پھل، وافر مقدار میں کم سے کم قیمت پر بکتے ہیں ملتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے، جسے بیت اللہ حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔

چشمۂ زمزم

حضرت ابراہیمؑ تو دعا مانگ کر اپنے نئے مستقر پر واپس چلے گئے۔ اور اس بیابان و سنسان جگہ پر دو ناتواں جانیں ——— ایک شیر خوار بچہ اور ایک اُس کی ماں ——— تنہا رہ گئیں۔ حضرت ہاجرہ خود کھجوریں کھاتیں اور پانی پیتیں اور بچہ کو دودھ پلاتیں۔ چند دنوں میں یہ سامانِ خور و نوش بھی ختم ہو گیا۔ اب بچے اور ماں کو بھوک پیاس نے ستانا شروع کیا۔ پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر ماری ماری پھریں، لیکن نہ کوئی چشمہ ملا اور نہ آدمی جس سے پانی لیتیں۔ اسی اضطراب میں صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگائے، لیکن پانی اب بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ آخری مرتبہ جب مروہ پہاڑی پر پہونچی تو کوئی آواز سنائی دی، دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا۔ پھر خاموش ہو کر کان لگا کر سنا پھر وہی آواز آ رہی تھی، لیکن نظر کوئی نہ آ رہا تھا۔ بے تاب ہو کر بولیں، "اے شخص تو نے مجھے اپنی آواز تو سنادی، ذرا یہ تو بتا کہ میری اس بے تابی و تشنگی کا بھی تیرے پاس کچھ مداوا ہے۔" نظر اٹھائی تو دیکھا کہ زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ ——— جبریل امین ہیں اور اپنے بازو یا

ایڑی سے زمین کھود رہے ہیں۔ یہاں تک کہ پانی نکل آیا ہے۔ اس نعمت غیر مترقبہ پر جو خوشی انھیں حاصل ہوئی ہوگی اس کا اندازہ وہی مسافر لگا سکتا ہے جس کی جان لبوں پر آگئی ہو اور پانی تلاش کرتے کرتے نڈھال ہو کر مایوس ہو چکا ہو، اور پھر اچانک اُسے پانی نظر آجائے ایسے میں اُسے جو خوشی حاصل ہوگی اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت ہاجرہ نے جلدی جلدی مشکیزہ میں پانی بھرنا شروع کردیا۔ ان کا خیال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی جان بچانے کے لئے اچانک یہ تھوڑا سا پانی بھیج دیا ہے، اس لئے اس کو محفوظ کرنے کے لئے جلد از جلد اس کے اردگرد باڑھ بنادی، لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ جتنا پانی بھرتی جاتی تھیں، اتنا ہی پانی ابلتا جاتا تھا۔ ان کی اس ہی کیفیت کو نبی اکرمؐ نے یوں بیان فرمایا ہے۔

"اللہ تعالیٰ اسماعیلؑ کی والدہ پر رحمت کرے، اگر وہ زمزم کو اُسی حالت پر چھوڑ دیتیں تو زمزم بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔"

خیر، حضرت ہاجرہ نے پانی پیا اور اپنی پیاس بجھائی۔ اپنے تشنہ لب بچے کو دودھ پلایا اور سیراب کیا۔

اب جبرئیلؑ نے حضرت ہاجرہ سے کہا۔ "ضائع ہونے کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے، جسے یہ بچہ اور اس کا باپ، دونوں تعمیر کریں گے، اور اللہ تعالیٰ اس گھر کو ضائع نہ کرے گا۔"

جبرئیل امین کی اس شہادت سے حضرت ہاجرہ کی ڈھارس بندھی، اپنے شوہر سے ملنے کی پھر امید ہوگئی، اور اپنے بچے کے پھلنے پھولنے کا یقین ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد قبیلۂ جُرہُم کے کچھ لوگ اس طرف آنکلے۔ انھوں نے دیکھا کہ قریب ہی ایک مقام پر پرندے چکر لگا رہے ہیں۔ صحرا نشین اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسے سنسان مقام پر پرندوں کا چکر لگانا بے معنی نہیں، یہاں ضرور کوئی پانی کا چشمہ ہوگا، اور شاید کوئی بستی بھی ہو۔ واقفیتِ حال کے لئے انھوں نے اپنے چند آدمی بھیجے۔ انھوں نے دیکھا کہ واقعی وہاں پانی موجود ہے اور دو انسانی جانیں بھی موجود ہیں۔ انھوں نے واپس جاکر قافلے والوں کو سارا ماجرا سنایا۔ ایسی سنسان اور بنجر جگہ پر

جہاں دور دور تک پانی نہ ہو، پانی کا دریافت ہونا ایسا واقعہ نہ تھا جو بھلا دیا جاتا ۔ سرسبز و شاداب علاقوں میں اگر پانی نہ ملے تو وہاں جان پر بن جاتی ہے ۔ ریگستان و صحرا میں اس کی جو بھی قدر و قیمت ہو وہ کم ہے ۔ وہاں تو آب و جان ہم معنی لفظ ہے ۔ جہاں پانی ہو گا وہاں زندگی ہو گی ، اور پانی نہ ہو تو زندگی بھی مفقود ۔ پانی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے ، اور جتنی بڑی یہ نعمت ہے اللہ تعالیٰ نے اتنی ہی فراوانی سے عطا کیا ہے ۔

قافلے والے دوڑے دوڑے اس مقام پر آئے ، حضرت ہاجرہ سے ملے ، ان سے ٹھہرنے کی اجازت چاہی ۔ جو آپ نے دے دی ۔ یوں حضرت ابراہیمؑ کی اُس دعا کی قبولیت کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ، جو انھوں نے کی تھی ، کہ

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ

"پس لوگوں کے دِل ان کی طرف مائل کر دے ۔"

اس طرح مکہ کی یہ بستی بسنا شروع ہو گئی ۔ اور حضرت اسماعیلؑ اس میں پلتے اور بڑھتے رہے ۔

ابتلائے عظیم

حضرت ابراہیمؑ اپنے اکلوتے بچے حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کو اللہ کے حوالے کر کے فلسطین واپس آئے اور حبرون کو اپنا مرکز دعوت بنایا، اور اپنی دعوت پھیلانے لگے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے فرزند کو جو ہزاروں تمناؤں اور آرزؤں کا مظہر تھا یوں ہی چھوڑ بیٹھتے۔ وقتاً فوقتاً آپ ان کی خبر گیری کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۳۔۱۴ سال گزر گئے اور وہ شیر خوار بچہ دوڑنے بھاگنے کے قابل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر حضرت اسمٰعیل کی شکل میں جو انعام عظیم کیا تھا اب اس کا امتحان بھی لیا۔ ان کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کی یہ خاص سنت رہی تھی۔ کہ جو بھی انعام دیا جاتا اس کے ساتھ ہی آزمائش کی جاتی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اتنی بڑی نعمت پر کوئی آزمائش نہ ہوتی؛ چنانچہ آزمائش ہوئی اور ایسی سخت آزمائش ہوئی کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں۔

خوابِ ابراہیمؑ

جب حضرت اسمٰعیلؑ ۱۳۔۱۴ سال کے ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے لختِ جگر اسمٰعیل کو ذبح کر رہا ہوں۔

نبیوں کے خواب، عام انسانوں کے اوہام کی طرح نہیں ہوتے کہ آدمی نے خیال کیا کیا نہ کیا نہ کیا۔ نبیوں کے خواب تو نبوت کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور وحیٔ خداوندی کی ایک قسم۔ اس کی تعمیل کرنا اور اس کو پورا کر دکھانا ان پر لازم ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی خواب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو صلح حدیبیہ سے قبل دکھایا تھا جس کو پورا کرنے کے لئے آپ نے عمرہ کا قصد فرمایا اور بالآخر وہ صلح حدیبیہ پر منتج ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ کی اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت بیان فرمائی ہے کہ

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ○

(البقرۃ: ۱۳۱)

"اور یاد کرو وہ وقت جب اس کے رب نے اُس سے کہا کہ سرِ تسلیم خم کرو۔
تو (ابراہیمؑ) نے کہا کہ میں نے سر جھکا دیا ربّ العالمین کے سامنے۔"

یہ اطاعت گزاری، یہ فرماں برداری اور سرفگندی جس کی پوری زندگی کا طرۂ امتیاز رہی ہو۔ وہ کسی بھی موقع پر پیچھے کیسے رہ سکتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کی تعمیل میں رختِ سفر باندھا، اور حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس پہونچے۔ یہ واقعہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا عظیم ترین واقعہ ہے اس لئے قرآن مجید نے بھی اس کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ إِنِّيْٓ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيْٓ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۚ قَالَ يٰٓأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِيْٓ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (الصّٰفّٰت: ۱۰۲)

"وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا۔ تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا، "بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں، کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟" اُس نے کہا، "ابّا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اُسے کر ڈالئے، آپ انشاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔"

ایک ایسے باپ کے دل سے ذرا سوچئے کہ جس کے بڑھاپے میں ایک ہی بیٹا ہو، اور بڑھاپے کا سہارا ہو۔ بیٹا بھی صالح، نیک، فرماں بردار اور سعادت مند ہو، جوانی کی سرحدوں میں داخل ہو رہا ہو اور جس سے امید کی جاتی ہو کہ آئندہ نہ صرف وہ خاندان کا بوجھ اٹھانے والا بنے گا، بلکہ اُس عظیم مقصد، اُس عظیم دعوت کو پھیلائے گا جس کے لئے والد نے ساری عمر قربان کر دی تھی۔ اُس بیٹے کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ذبح کرنے کو تیار ہو جائے۔ اور وہ بھی محض خدا کی خوشنودی کی خاطر، کسی غصے یا ناراضگی سے نہیں۔ یہ بات کہتے ہوئے حضرت

ابراہیم کے دل پر کیا گزرگئی ہوگی ۔ خاک و خون میں تڑپتی ہوئی بیٹے کی لاش کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا ہوگا ۔

پھر ایک عجیب صورت حال بھی دیکھئے ۔ حضرت ابراہیمؑ کا باپ اپنے بیٹے سے برہم ہو کر محض اپنا غصہ بجھانے کے لئے اپنے بیٹے کو ظالموں کے حوالے کر دیتا ہے کہ اُسے آگ میں جلا دیں ۔

دوسری طرف وہی فرماں بردار بیٹا محض اپنے خدا کے حکم کو پورا کرنے کے لئے ٹھنڈے دل سے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ۔ کتنا فرق ہے دونوں باپوں میں اور اُن کے ارادوں میں ۔

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے ایک صالح بیٹے کی درخواست کی تھی ۔ اب وہ اپنی دعا کی قبولیت کا رنگ دیکھنا چاہتے تھے کہ انھیں وہی صالح بیٹا ملا ہے جس کے لئے رب العالمین سے گزارش کی گئی تھی ۔ یا کوئی اور ۔ یہ جانچنے کے لئے وہ پہلے بیٹے سے سوال کرتے ہیں کہ بیٹا میں خواب میں تمہیں ذبح کرتا ہوا دیکھتا ہوں ، بتاؤ اس بارے میں کیا خیال ہے ؟

فرماں بردار فرزند

وہ عظیم باپ کا عظیم فرزند ، جس کو اللہ تعالیٰ نے " غلام حلیم " کا لقب دیا تھا ۔ اور خدا سے زیادہ ایک انسان کی جبلتوں اور صلاحیتوں سے کون واقف ہو سکتا ہے ——— اپنے حلم اور سلامت روی کا بھر پور ثبوت دیتا ہے ۔ نہ ڈرتا ہے نہ ہچکچاتا ہے ، نہ جان بچانے کی فکر کرتا ہے ، نہ باپ پر الزام تراشی کرتا ہے ، پوری متانت اور طمانیتِ قلب کے ساتھ جواب دیتا ہے کہ ابا جان ! آپ کو جو کچھ حکم دیا گیا ہے ، اُسے کر ڈالیئے ، انشاءاللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے ۔ میں نہ بھاگوں گا ، نہ شور و واویلا کروں گا ، نہ بہانے تراشوں گا ، اور نہ جان بچانے کی فکر کروں گا ۔ جو اللہ کا حکم ہے اُسے پورے صبر و شکر کے ساتھ قبول کروں گا ۔

بیٹے کو پورا موقع حاصل تھا کہ کہتا ۔ ابا جان ! آپ صرف ایک خواب کی بنا پر میری جان کے پیچھے پڑے ہیں ۔ پہلے مجھے بیابان سنسان جگہ پر مرنے کے لئے چھوڑ گئے اور اب جب کہ میں کسی نہ کسی طرح بچ گیا اور کھانے کمانے کے قابل ہو چلا تو اب بھی چین نہ آیا اور

خواب کے بہانے میرے گلے پر چھری چلانے آگئے۔ اگر ایسے نازک موقع پر وہ ایسا جلا کٹا جواب دیتے تو یہ انسانی فطرت سے کچھ بعید نہ تھا۔ لیکن وہ تو ایک عجیب بیٹا تھا، ایک عظیم نبی کی دعاؤں کا مجسم ظہور تھا۔ خدائے علیم وخبیر کی بشارت کا انسانی پیکر۔ دعوتِ ابراہیمی کا وارث بننے والا تھا۔ اس کے صلب سے تو وہ بدرِ کامل پیدا ہونے والا تھا۔ جو سارے جہانوں کے لئے رحمۃ اللعالمین ثابت ہوا۔ اور جس نے بڑی سے بڑی اذیت پر اپنے مخالفین کے لئے ہاتھ اٹھائے تو کس لئے، اس دعا کے لئے کہ۔

"اے میرے رب میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ جانتی نہیں کہ کیا کر رہی ہے"۔

وہ جانتے تھے۔ کہ میرا والد نبی ہے اور نبی کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ انھوں نے پوری آمادگی سے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں قربان ہونے کے لئے پیش کر دیا۔

ابراہیمؑ کو اطمینان ہوا کہ میں نے جو دعا مانگی تھی۔ وہ اب حقیقت بن کر میرے سامنے آگئی ہے۔ اب حکم ربانی کی تعمیل میں دیر نہیں کرنا چاہیئے، مبادا شیطان قدم ڈگمگا دے اور اطاعت الہٰی کے راستے سے بچلا دے۔ اب چشم فلک نے وہ نظارہ دیکھا جو نہ اس سے پہلے دیکھا گیا۔ اور نہ بعد کو جس کو قلم بیان کرنے سے عاجز اور دماغ تصور کرنے سے قاصر قربانیٔ اسمٰعیل

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۚ (الصّٰفّٰت: ۱۰۳)

"آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا۔"

انقیاد و تسلیم کی یہ انتہا تھی۔ ایک بندۂ مسلم وفانت تسلیم و رضا کا جو زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر سکتا تھا وہ یہی تھا۔ آدمی اپنے بال بچوں کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاتا ہے، لیکن بچوں پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ انسان تو خیر اشرف المخلوقات ہے، ایک معمولی چڑیا تک اپنے بچوں کو بچانے کے لئے اپنی جان نثار کر دیتی ہے، لیکن یہ انسانیت کی نہیں، مسلمانی کی معراج تھی کہ آدمی اپنے لختِ جگر کو، اور وہ بھی اکلوتا، خدا کی راہ میں قربان کر دے اور بخوشی و رضامندی، اور اس کی پیشانی پر بل نہ آئے۔

حکم الٰہی کی تعمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جگر گوشے کو ماتھے کے بل لٹایا، تاکہ وہ معصوم چہرہ دیکھ کر شفقتِ پدری جوش نہ مارے اور دستِ استقامت میں لرزش نہ آنے پائے۔ لٹاتے ہی گلے پر چھری پھیر دی۔ ہائے ہائے، کیا اندوہناک منظر ہوگا کہ جس بیٹے کو ۱۳-۱۴ سال تک پالا پوسا، پرورش کیا، اس کی خبر گیری کے لئے سینکڑوں میل کا بارہا سفر کیا، اس ہی لاڈلے، ہونہار بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کے لئے گلے پر چھری پھیر دی۔ اللہ اکبر، کیا شانِ بندگی تھی۔ اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ گلا کٹ جاتا، شہ رگ سے خون کی دھار چھوٹتی اور بیٹے کی لاش تڑپتی ہوتی، اور کچھ دیر میں پھڑک پھڑک ٹھنڈی ہو جاتی۔

لیکن قربان جایئے اس رحیم و کریم کے کہ اُس نے پھر ایک بار اپنی رحمت و شفقت کا ایسا نظارہ کرایا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ کو تو حضرت ابراہیمؑ کے جذبۂ تسلیم و رضا کا امتحان لینا مقصود تھا، اسمٰعیلؑ کی جان لینا مقصود نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تو اولاد نسلِ انسانی کی بقا کے لئے عطا کی ہے، نہ کہ والدین کے ہاتھوں ذبح کرا کے نسلِ انسانی کو ختم کرانے کے لئے۔ وہ تو دنیا کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ میں جس کو اپنا خلیل بنا رہا ہوں وہ کس جذبۂ فداکاری سے سرشار ہے۔ وہ تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ جس کو "اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" (میں تجھ کو لوگوں کا امام بناؤں گا۔) کی خلعت عطا کر رہا ہوں وہ کس پایہ کا انسان ہے، اور وہی اس انعام فاخرہ کا مستحق ہے۔ ابراہیمؑ کے ذمہ جو کام تھا وہ ادا کر چکے تھے، اب اس کو قبول کرنا اور اس کا اجر عطا کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے صابر و شاکر بندوں کی قربانی قبول کی اور ایسا بھرپور اجر عطا کیا۔ جو قیامت تک جاری رہے گا۔ اور آخرت میں اس کا جو اجر ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے جو اس دنیا میں عطا کیا گیا۔ ذاتِ حق نے جب اپنے بندے کی یہ فداکاری دیکھی تو پکار اٹھی۔

وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝

(الصّٰفّٰت: ۱۰۴-۱۰۶)

"اور ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیم، تو نے خواب سچا کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے

والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔"

وہ جزا کیا تھی جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی۔ فوری جزا تو یہ تھی کہ چھری اپنی ساری تیزی اور دھار کے باوجود کند ہو کر رہ گئی۔ اور اسمٰعیلؑ کے خراش تک نہ آئی۔ یہ اس جزا کا اعادہ تھا جو پہلے باپ کو دی گئی تھی یعنی

يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ (الانبیاء: ۶۹)

"اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا۔"

اب وہی جزا بیٹے کے لئے اس صورت میں نمودار ہوئی کہ تیز چھری کند ہو کر رہ گئی۔

جزائے عظیم

دوسری جزا یہ ملی کہ دونوں باپ بیٹوں کو اللہ تعالیٰ نے درجاتِ عالیہ سے نوازا۔ باپ کو اپنا خلیل اور لوگوں کا امام بنایا۔ اور بیٹے کی جان بھی بچائی۔ اور "ذبیح اللہ" کا خطاب بھی دیا۔

اور تیسری جزا یہ ملی کہ۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝
سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(الصّٰفّٰت: ۱۰۷-۱۱۰)

"اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لئے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیمؑ پر۔ ہم محسنین کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔"

حضرت اسمٰعیلؑ کو چھری کے نیچے سے صحیح و سلامت نکالا۔ اور ان کے بدلے ایک تندرست مینڈھا بھیجا کہ اس کی قربانی کی جائے، اور اس قربانی کو سنت ابراہیمی قرار دے کر قیامت تک کے لئے اہل ایمان میں جاری کر دیا کہ ہر سال اسی تاریخ کو یعنی ۱۰ ذی الحجہ کو جانوروں کی قربانی دیں اور امام المسلمین کی قربانی کو یاد رکھیں۔ پھر اتنا ہی نہیں ہمیشہ کے لئے ان پر درود و سلام کی باران رحمت کر دی۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ آج چار ہزار سال گزر جانے کے باوجود کروڑوں انسان كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ کا

وِرد کرتے ہیں۔

اور اس قربانی کے صدقے میں تمام اہلِ ایمان کو مژدہ سنا کر کہ

كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ○

"ہم محسنین کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔"

خدا کی راہ میں قربانی دینے والے ہر مسلمان کو جزا کا یقین دلا دیا۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ

اور پھر اُن کے جذبۂ ایمانی کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الصّٰفّٰت : ۱۱۱)

"بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔"

اس ایک فقرہ میں ایک طرف اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے جذبۂ ایمان پر مہرِ تصدیق ثبت کی تو دوسری طرف تمام انسانوں کو راہِ ایمان بھی بتا دی، مقامِ ایمان کی نشاندہی بھی کر دی اور عظمتِ ایمان بھی بیان فرما دی۔

یہاں بتایا کہ اگر تم بندہ مومن بننا چاہتے ہو تو تمہارے سامنے ابراہیمؑ کی مثال موجود ہے ان کی روش اختیار کرو تو مومن بندوں میں شمار ہوگا۔

"لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا"

اپنی جان، مال، عزت، آبرو اور اولاد ــــ سب کو اللہ کی راہ میں قربان کرو، تو زمرہ مومنین میں شمار کئے جاؤ گے۔

یہاں یہ بھی بتایا کہ اگر تم نے ابراہیمؑ کی یہ مومنانہ روش اختیار کی تو تم پر بھی انعام واکرام کی اُسی طرح بارش ہوگی جس طرح تمہارے جدِّ امجد ابراہیم پر کی گئی ہے۔

یہاں یہ بھی بتایا کہ اگر دنیا کی سرخروئی اور آخرت کی کامیابی چاہتے ہو تو اُسی راہ سے گزرنا ہوگا جس سے ابراہیمؑ گزرے ہیں۔

عالمی امامت کا عطیہ

عنفوانِ شباب سے بڑھاپے کی اس منزل تک ابراہیمؑ نے جو قربانیاں دی تھیں، وہ اُن کی استقامت، عزیمت، مقصد سے لگن، اللہ کے حکم کے سامنے کامل سپردگی اور اطاعت و فرماں برداری، اخلاق و حقیقت کی منہ بولتی تصویریں تھیں اور اس بات کا نشانی ثبوت تھیں کہ عالمی امامت کے لئے جس سیرت و کردار کی حامل شخصیت کی ضرورت ہے، وہ سب اُن میں رچی بسی ہوئی تھیں ۔

● ایک ایسی قوم کے درمیان جو شرک کی ہر شکل میں پوری طرح ڈوبی ہوئی تھی، جو صد درجہ کٹ حجت، ضدی اور دینِ آباء کے لئے متعصب تھی، تن تنہا اللہ کا کلمہ بلند کیا، اور خدائے واحد کی بندگی کی طرف دعوت دی۔ اور اس کی برہمی، غضب ناکی، مقاطعہ، ہر چیلنج کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا ۔

● ایک ظالم و جابر اور بھپرے ہوئے اقتدار کے مقابلے میں جس استقامت کا ثبوت دیا اس کی تاریخِ انسانی میں کوئی نظیر نہیں۔ آپ نے جلتی ہوئی آگ میں کود جانا پسند کیا، لیکن اپنی دعوت سے دست بردار ہونا یا اس میں مداہنت کرنا گوارا نہ کیا ۔

● اپنے خدا کے حکم کے تحت اور اپنے مشن کی خاطر آپ نے گھر بار، خاندان و قوم اور ملک و وطن کو چھوڑنا گوارا کیا، لیکن دعوت و نصب العین کو ترک کرنا قبول نہ کیا ۔

● محض خدا کے فرمان کو پورا کرتے اور رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی محبوب بیوی اور بڑھاپے کی آخری امید اپنے اکلوتے بیٹے کو ایک سنسان غیر آباد جگہ میں چھوڑ کر اپنی اخلاص مندی اور سمع و طاعت کا ناقابلِ تردید ثبوت پیش کیا ۔

◎ اور ان سب کے بعد اشارۂ الٰہی پاتے ہی اپنے لختِ جگر، آرزوؤں اور امیدوں کے مرکز، بقائے نسل کے واحد نشان کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا ایسا عظیم مظاہرہ پیش کیا جس کی مثال تاریخِ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔

۸۶ سال تک مسلسل قربانی اور اطاعت و فرمانبرداری کا ایسا شاندار ریکارڈ تھا، جس کے بعد اب کسی مزید ثبوت کی ضرورت و حاجت باقی نہ رہی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی جاں سپاری اور وفاداری کا آپ کو اجر عطا فرمائے اور سندِ قبولیت سے مشرف فرمائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قدر دانی کے طور پر اعلان فرمایا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ (البقرۃ: ۱۲۴)

"یاد کرو کہ جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن سب میں پورا اتر گیا، تو اس نے کہا۔ "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔"

مالک الملک کی جانب سے صرف یہ اعلان کہ "میں پیشوا بنانے والا ہوں" اس بات کے لئے کافی تھا کہ آپ مسندِ امامت پر فائز ہو گئے۔ یہ نعمت مل جانے کے بعد قدرتی طور پر آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ آپ اپنی اولاد کے لئے بھی اس منصبِ جلیل پر مسند آرائی کی درخواست پیش کریں اور یہ خواہش بلاوجہ بھی نہ تھی۔ یہ درخواست محض اجرا ِ وراثت کے جذبے سے بھی نہ کی گئی تھی۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ انھوں نے جس صالح اولاد کے لئے درخواست کی تھی وہ آپ کو مل گئی تھی۔ آپ اپنے فرزند جلیل کی اللہ کی راہ میں استقامت، صبر و شکر اور تسلیم و رضا کی حیرت انگیز صلاحیت کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ جو مشن اور دعوت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کیا ہے اس کو جاری رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے جو غلام حلیم عطا کیا ہے، وہ پوری طرح اس کو نباہنے کا اہل ہے۔ اس لئے آپ نے درخواست کی:

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ (البقرۃ: ۱۲۴)

"ابراہیمؑ نے کہا اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔"

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ○

" اللہ نے فرمایا میرا وعدہ ظالموں سے نہیں ۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تیری اولاد کو یہ منصب جلیل نہیں دوں گا، بلکہ فرمایا ظالموں سے یہ وعدہ نہیں۔ یعنی درخواست تو منظور کرلی گئی، لیکن مشروط۔ تمہاری نسل میں جو لوگ تمہارے راستے پر چلیں گے وہ اس امامت کبریٰ کے حامل ہوں گے، لیکن جو لوگ اس راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے کو اختیار کریں گے ان کے لئے کوئی وعدہ نہیں۔

عطائے امامت کے شرائط

اس حسن قبولیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ قانون بھی بیان فرمادیا جو اُس نے امامت عطا کرنے کے بارے میں مقرر فرمایا ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے:

- اللہ تعالیٰ کے یہاں حسب ونسب، خاندان اور قبیلہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو کچھ قدر ہے، وہ ذاتی محاسن واوصاف کی ہے۔ جس کی سیرت وکردار جتنی پاکیزہ ہوگی۔ اس کے اتنے ہی درجات بلند ہوں گے۔ کوئی باپ نہ اپنے بیٹے کے کام آسکتا ہے، جیسے نوحؑ، اور نہ ہی کوئی بیٹا اپنے والد کے کام آسکتا ہے، جیسے ابراہیمؑ۔
- امامتِ عالم کسی شخص کو وراثت کی بنیاد پر نہیں دی جاتی، بلکہ خالص ذاتی اوصاف واستحقاق کی بنا پر عطا کی جاتی ہے۔ اگر ورثاء ان اوصاف سے متصف ہیں جو ان کے مورثِ اعلیٰ کے اندر موجود ہے۔ تو نورٌ علیٰ نور۔ لیکن اگر وہ ان اوصاف کے حامل نہیں تو یہ امامت اللہ کسی اور مناسب اور مستحق شخص کو منتقل کردیتا ہے۔
- اللہ تعالیٰ نے اپنے جتنے انعام واکرام عطا کرنے کے وعدے کئے ہیں۔ وہ مومنین، محسنین اور صالحین سے کئے ہیں، جو اپنی قربانیوں اور جان نثاریوں سے اپنا مومن ومحسن اور صالح ہونا ثابت کردیتے ہیں۔
- اللہ تعالیٰ محض اپنے علم کی بنا پر نہ کسی کو نوازتا ہے اور نہ کسی کو سزا دیتا ہے، اور نہ محض زبانی دعوے کی بنا پر کسی کا درجہ ومقام متعین فرماتا ہے۔ جب تک کوئی شخص اپنے اعمال وکردار سے اپنے دعوے کی حقانیت ثابت نہ کردے اس وقت تک

اس کا کوئی دعویٰ قابلِ قبول نہیں۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر واضح فرمایا ہے۔ مثلاً:-

○ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○ (البقرۃ: ۱۵۵)

"اور ہم تم کو ضرور آزمائیں گے، کچھ خوف سے، بھوک سے، مالوں اور جانوں کے نقصان سے اور ثمرات کے زیاں سے۔"

○ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُّتْرَكُوْٓا أَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○ (العنکبوت: ۲-۳)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دئے جائیں گے اور ان کو نہیں آزمایا جائے گا۔ اور ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو آزمایا ہے، تاکہ اللہ جان لے کہ کون (دعوئے ایمان میں) صادق ہے اور کون کاذب۔"

○ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۟ أَخْبَارَكُمْ ○ (محمد: ۳۱)

"اور ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے یہاں تک کہ ہم جان لیں کہ تم میں سے کون مجاہد ہے، اور کون صبر کرنے والا اور تمھارے احوال کو جانچیں گے۔"

تعمیرِ کعبہ ——— عالمی مرکزِ دعوت

اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو عالمی امامت کے منصب جلیل پر سرفراز فرمایا تھا، یہ ضروری تھا کہ اس دعوت کا ایک ایسے مقام پر مرکز قائم کیا جائے جہاں ہر سمت سے، ہر موسم میں لوگ پہونچ سکیں، اور لوگ اس کی طرف رجوع کر سکیں۔

اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ کو منتخب فرمایا اور اس سرزمین کو یہ شرف بخشا کہ اہل ایمان کا مرکز قرار پائے۔ اور اُس مرکز کی توقیر و منزلت کے لئے اس کو اپنا گھر قرار دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَ الْقَآىِٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝ (الحج : ۲۶)

"یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ "میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔"

اللہ کی تدابیر ——— فہم سے بالاتر

خانۂ کعبہ کے لئے جس طرح جگہ کا انتخاب کیا گیا، اس کی جس طرح تعمیر کی گئی اور اس کو جس طرح مرکزیت عطا کی گئی، ان سب باتوں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیریں کتنی دُور رس اور گہری ہوتی ہیں کہ انسان کی وہاں تک نظر پہنچ ہی نہیں سکتی۔ برسوں بلکہ صدیوں کے بعد کہیں انسان یہ سمجھ پاتا ہے کہ اس کام میں یہ حکمت

تھی اور بسا اوقات یہ بھی نہیں ہوتا۔ انسان کو جو محدود صلاحیتیں دی گئی ہیں اُن کے پیش نظر اُس کے بس میں یہ ہے ہی نہیں کہ وہ اپنی ناک کے نیچے سے کہیں آگے کا بھی سوچ سکے۔ اس لئے انسان کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ اپنے عجز کا اعتراف کرے۔ اور ہدایت ربانی کی بے چون وچرا اطاعت کرے چاہے۔ اس کی سمجھ میں کسی کام کی حکمت آئے یا نہ آئے۔ عقلیت پسندوں کا یہ دعویٰ کہ جب تک کسی کام کی عقلی توجیہ سمجھ میں نہ آئے اختیار نہ کیا جائے، ایک خود فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کیا خدائے خبیر و بصیر کے سوا کوئی انسان یہ سوچ بھی سکتا تھا کہ اس سنسان بے آب وگیاہ، چٹیل میدان میں حضرت اسمٰعیل کو شیر خوارگی کی حالت میں یہاں چھوڑنے کا مطلب کیا ہے؟۔ ظاہر بین آنکھ زیادہ سے زیادہ یہی دیکھ سکتی تھی کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کی ایک صورت ہے۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے آگے کیا؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اور نہ ہو سکتا تھا۔

جس دن حضرت اسمٰعیلؑ کو یہاں لاکر بسایا تھا۔ دراصل اُسی دن اس بات کی داغ بیل ڈال دی گئی تھی کہ شجر اسلام کی کونپلیں یہیں سے پھوٹیں گی، اور پھر یہی ننھا سا پودا ایک دن تناور درخت ہو کر برگ و بار لائے گا، اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں ایک عالم چین و سکون پائے گا۔ یہی شجر سدا بہار پروان چڑھ کر ایک دن سارے عالم کے لئے رحمت ——— رحمۃ للعالمین ——— ثابت ہوگا۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ○ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ○

(ابراہیم: ۲۴-۲۵)

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لئے دیتا ہے

کہ لوگ اِن سے سبق حاصل کریں ۔

اللہ کی حکمت بالغہ

اب آپ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ دیکھئے ۔شیرخوار اسماعیل کو اللہ تعالیٰ نے دعوت اسلامی کے ایک ننھے بیج کی شکل میں یہاں لاکر جمایا ۔ ان کی پرورش کا بندوبست فرمایا اور اُن کے لیئے کے یہیں انتظامات فرمائے ، تاکہ یہ بیج یہاں جم سکے ، اس کی جڑیں گہری ہوں اور ایک دن تناور درخت کی شکل میں اس دعوت کا اتمام ہو اور اس کی ٹھنڈی چھاوں سے ایک عالم مستفید ہو ۔

پھر حضرت اسماعیلؑ کو یہاں بسانے کا مطلب یہ بھی تھا کہ یہیں پر وہ مرکز ہدایت قائم ہوگا، کیونکہ اس دعوت کا امین اب یہاں آگیا ہے اور یہیں سے اب اُس آفتابِ عالم تاب کی ضیاء باریاں ہوں گی جس سے قیامت تک یہ عالم منور رہے گا ۔

پھر اللہ تعالیٰ نے جس طریقے سے اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم دیا اور ان کی جگہ قربانی کی داغ بیل ڈالی ، اُس سے سنت ابراہیم و اسمٰعیل کو قیامت تک کے لئے دوام بخش دیا ، تاکہ یہ مرکز اسلام کہیں اور منتقل نہ ہوسکے ۔ کوئی بھی عقل انسانی یہ بات نہ سوچ سکتی تھی کہ یہ رسم قربانی جو جاری کی گئی ہے یہ دراصل اس دعوت کی سیرابی کا سالانہ اہتمام کیا گیا ہے جس سے ایک طرف ہر سال یہ دعوت تازہ ہوتی رہے گی ، تو دوسری طرف اس دعوت کے پیرو دنیا کے ہر گوشے سے ہر سال آ آکر ایک نئی زندگی پاتے رہیں گے ۔

اس اہتمام و انتظام کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ اب اس مرکزِ اسلام کی تعمیر کا وقت آگیا ہے جس کے لئے یہ سارے انتظامات کئے گئے تھے ۔ فرمایا ۔

”اور یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی ۔“

جگہ تجویز کرنے کے بعد مقصدِ تعمیر اور تدابیرِ استحکام بھی بتا دیں ۔ فرمایا :

”(اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو ۔ اور

میرے گھر کا طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع وسجود کرنے والوں
کے لئے پاک رکھو۔"

یعنی چونکہ یہ گھر مرکز توحید ہوگا جہاں سے ایک عالم کو دعوت توحید پہنچے گی۔ اس لئے اس کی اوّلین ضرورت یہ ہے کہ اس گھر کو ہر قسم کی شرک کی آلودگی سے پاک و صاف رکھا جائے۔ اور شمع توحید کے پروانے جب یہاں آئیں تو ضیاء توحید سے منور ہوکر واپس جائیں۔ اس کے لئے نہ صرف یہ کہ اس کی ظاہری صفائی و پاکیزگی کا اہتمام کیا جائے۔ بلکہ اس کی باطنی و معنوی طہارت میں بھی کسی قسم کا میل نہ آنے پائے۔

معماران کعبہ کی آرزوئیں

جب ابراہیمؑ کو تعمیر مرکز کا حکم مل گیا تو انھوں نے اپنے عظیم بیٹے اسمٰعیلؑ کو، جنھیں آئندہ اس مکان کا امین بننا تھا ساتھ لیا اور اس کی تعمیر شروع کردی۔ یہ باپ بیٹے جن نیک تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ اس گھر کی تعمیر کر رہے تھے، وہ ان کی اس دعا کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی، جو اس موقع پر انھوں نے مانگی۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ
مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (البقرۃ: ۱۲۷)

"اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسمٰعیل اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے:" اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے، تو سب کی سننے اور جاننے والا ہے۔"

یعنی یہ خدمت تعمیر صرف تیری رضا کے لئے اور تیرے حکم کی تعمیل میں ہے، یہ نذرانۂ خدمت قبول فرما۔ ہم جس نیت سے یہ کام بجالائے ہیں، اس کو تو سب سے بہتر جانتا ہے، کہ تو ہی تو زبانوں کی پکار اور دلوں کی دھڑکنوں کو سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔

پھر اپنی اور اپنی اولاد کے لئے دعا کرتے ہوئے عرض کیا:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ (البقرۃ: ۱۲۸)

"اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرماں) بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا۔ اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

یہ دعا ایک مومن کے جذبات کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔ ایک مومن صرف اپنی ہی نجات اور بھلائی کے لئے نہیں سوچتا، بلکہ اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد بھی ویسی ہی صالح اور نیک ہو، جیسی اس کی اپنی ذات ہے، اور اُن تمام بھلائیوں اور خوبیوں کی حامل ہو اُسے اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں۔

داعیانہ صفات

پھر اُس دعا میں ان کی وہ داعیانہ صفات بھی پوری طرح منعکس ہیں، جن سے ان کی پوری زندگی منور تھی۔

ایک داعی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ خود اُس دعوت میں پوری طرح رنگا ہو جس کی طرف وہ دوسروں کو بلا رہا ہے۔

ایک داعی کی دوسری تڑپ یہ ہوتی ہے کہ جس دعوت کو اُس نے قبول کیا ہے۔ اور پھیلا رہا ہے، وہ اس کی ذات تک سمٹ کر نہ رہ جائے، بلکہ وہ چار سو پھیلے، اور اللہ کے بندے اُس میں جُوق در جُوق شامل ہوں اور اس کو اعوان و انصار کی ایک ایسی جمعیت حاصل ہو جو اس کے فروغ کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہے۔

اس کی تیسری سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس دعوت کے پیش کرنے، پھیلانے اور جمانے میں جو بھی لغزشیں، دانستہ و نادانستہ ہوگئی ہوں اُن سب کو معاف کیا جائے، اور جب کل اللہ کے دربار میں حاضر ہو تو اس حال میں پہنچے کہ اُس کے دامن پر کوئی دھبہ نہ ہو۔

اگر ابراہیم؈ صرف ایک قوم، ایک خطے یا ایک خاص نسل کے لئے مبعوث کئے گئے ہوتے تو یہ دعا کافی تھی، لیکن انھیں تو اللہ تعالیٰ نے "لِلنَّاسِ اِمَامًا" سارے انسانوں کے لئے امام بنا دیا تھا، اس لئے انھوں نے آئندہ نسلوں کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں

کو محسوس کرتے ہوئے مزید عرض کیا ۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (البقرۃ: ۱۲۹)

"اور اے رب، ان لوگوں میں خود انھیں کی قوم سے ایک ایسا رسولؐ اٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور ان کی زندگی سنوارے، تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے ۔"

ابراہیمؑ کو اپنی دعوت کے پھیلنے اور فروغ پانے کی جو فکر دامن گیر تھی اور وہ صرف اپنے زمانے ہی کی نسل کی نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کی بھی ہدایت کے لئے جس طرح مضطر تھے، اس کی یہ دعا پوری طرح آئینہ دار ہے ۔

اہلِ کعبہ کے لیے دعا

وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ جگہ جواب دعوت اسلامی کا مرکز بنی ہے، معلوم دنیا کے عین وسط میں واقع ہے ۔ اور اس بات کی پوری صلاحیت رکھتی ہے ۔ کہ اس دعوت کا عالمی مرکز بنے ۔

وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ جس طرح مادی طور پر یہ سرزمین انسانی زندگی کی تگ وتاز سے محفوظ (UNTAPPED) ہے، اسی طرح روحانی طور پر اس کے جوہر خفتہ وخوابیدہ (UNEXPLORED) ہیں، اور دعوت کے فروغ کے لئے نہایت زرخیز ثابت ہوسکتی ہے

وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اگر یہاں ایک ایسی زوردار اور جامع شخصیت دعوتِ دین کی علمبردار بن کر ابھرے ۔ جو آیات الٰہی کی تلاوت سے رطب اللسان، کتاب وحکمت کی دانش سے بہرہ ور اور تزکیۂ نفوس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیتوں سے پوری طرح مسلح ہو تو اس دعوت کو ایک عالمی طاقت بننے اور ساری دنیا کو منور کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا ۔

چنانچہ ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ نے ایک ایسی جامع ومانع دعا مانگی ۔ جو ان سب خوبیوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی ۔

آپ نے سب سے پہلے اُس قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے جو یہاں آباد ہوگی، ایک ایسے رسول بھیجنے کی التجا کی جو ان ہی میں سے ہو، تاکہ یہ قوم اس شرف سے سرفراز ہو سکے کہ اس کا ایک فرزند اللہ کا نبی ہے۔

پھر اُن صفات کا ذکر کر دیا جن سے اُن کی نظر میں یہ رسول متصف ہو، تاکہ اُس عظیم دعوت کا حق ادا ہو سکے جس کو یہاں ابھرنا تھا۔

آپ نے عرض کیا۔ "جو انھیں تیری آیات سنائے۔"

یعنی وہ ایک ایسا رسول ہو جو صاحب کتاب و شریعت ہو۔ لوگوں کو اللہ کا کلام سنائے، اس کے احکام و اوامر بتائے اور اس کے نواہی سے آگاہ کرے۔ اُس کی دعوت کا چرچا ہو اور پیغام ربانی زبان زد عام ہو۔

اس کی دعوت صرف زبانی کلامی نہ ہو کہ لوگ اس کو بہ آسانی مسخ کریں اور پھر گمراہی میں بھٹکتے پھریں، وہ دعوت نہ صرف سینوں میں محفوظ ہو، بلکہ کتاب کی شکل میں بھی موجود رہے، تاکہ لوگوں پر کبھی حقیقت مشتبہ نہ ہونے پائے اور ہر دور میں لوگ اس کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ یہ اُسی دعا کی قبولیت کا اثر ہے کہ آج ۱۴ سو سال گزرنے کے باوجود قرآن مجید ہر جگہ اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ سینوں میں حفظ کی صورت میں محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ کتابی شکل میں بھی پائی ہے انشاء اللہ قیامت تک رہے گا اور لوگ اُس سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

پھر مزید یہ عرض کیا۔ "اور اُن کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔"

یہ منصب رسالت کی تشریح بھی ہے اور رسول کی جامع شخصیت کی دلیل بھی ہے اور عامۃ الناس کی ضرورت کا اظہار بھی۔

عامۃ الناس کی فلاح و بہبود اور ان کی اصلاح و ہدایت کا آپ کو کتنا خیال تھا کہ اس ہی پر اکتفا نہ کیا کہ ان کی ہدایت کے لئے ایک رسول بھیجا جائے۔ بلکہ عرض کیا کہ ایسا رسول بھیجا جائے جو صاحبِ کتاب و شریعت ہو۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کتاب کے اندر جو حکمتیں بھری ہوئی ہیں ان سے لوگوں کو آگاہ کرے، ان کے مقتضیات انھیں سمجھائے، زندگی

کے مختلف پہلوؤں کے سنوارنے کے لئے اس میں جو ہدایات ہیں۔ ان سے انھیں آگاہ کرے اور ان ہدایات پر چلنے کے لئے جس حکمت و دانش کی ضرورت ہے وہ سمجھائے۔ آیاتِ الٰہی کی عملی شکل کا نمونہ پیش کرے تاکہ زندگی کے کسی بھی معاملہ میں اور کسی بھی موڑ پہ لوگوں کو تشنگی محسوس نہ ہو۔ چشمۂ نبوت سے سیراب ہو کر نہ صرف خود شاد کام ہوں، بلکہ قیامت تک ان کے سامنے روشنی کا وہ مینار رہے جس کو دیکھ کر وہ زندگی کی اندھیری راہوں میں رہنمائی حاصل کر سکیں۔

اور آخر میں کہا۔ "تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

یعنی اے رب العالمین! تیری ذات والا تبار بڑی قدرت والی ہے، ہر چیز پر تجھے پورا پورا اختیار ہے، تو اگر کسی بات کو کرنا چاہے تو تیرے لئے یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ تیرے ارادوں میں کوئی مخل نہیں ہو سکتا۔ پھر تو صاحب قدرت ہی نہیں، حکمت والا بھی ہے۔ اپنے ارادوں اور اسکیموں کی تعمیل اس انداز میں کراتا ہے کہ تیرے سوا وہاں کسی کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔ اگر اس بندۂ ناچیز کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمائے تو یہ تیری قدرت و حکمت کی نشانی ہوگی۔

قبولیتِ دعا ——— بعثتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلّم

ابراہیمؑ کی یہ دعا اللہ نے قبول فرمائی اور اس کی قبولیت سپیدۂ صبح کی طرح ظاہر ہوئی۔ تقریباً ڈھائی ہزار سال کے بعد اس ہی سرزمین سے، ان ہی کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم، سرور عالم، ختم الرسل، رحمۃ اللعالمین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرمایا۔ اور ان تمام صفات سے متصف فرمایا جن کی آپ کے جدِ امجد سیدنا ابراہیمؑ نے درخواست کی تھی۔

عطیۂ کتاب ——— قرآن مجید

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ایسی کتاب عطا فرمائی جو رہتی دنیا تک اپنی اصل شکل میں باقی رہے گی۔ جس کو کروڑوں بندگانِ خدا ہر صبح و شام تلاوت کرتے ہیں۔ اس کی اس ہی شان کی بنا پر اس کا نام قرآن مجید رکھا گیا اور اس کی حفاظت کا تو ذاتِ باری نے ذمہ لیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۹)

"بے شک ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے ، اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔"
اس میں انسانوں کے لئے ایسی ہدایت سمودی جو زندگی کے ہر معاملے میں اور ہر دور میں رہنمائی کرتی رہے گی ۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (الاسرآء: ۹)

"حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے ۔"

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ط

(الجن: ۱-۲)

"ہم نے ایک بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے ، اس لئے ہم اُس پر ایمان لے آئے ہیں ۔"

وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (المائدہ ۵: ۱۶)

"اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے ۔"

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۸)

"یہ لوگوں کے لئے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے ، اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ، ان کے لئے ہدایت اور نصیحت ۔"

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ج (الانعام: ۱۵۷)

"پس تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے ایک دلیل روشن اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے ۔"

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (النحل: ۸۹)

اور ہم نے اتاری تم پر کتاب ، جو ہر بات کی وضاحت کرتی ہے اور ہر تسلیم خم کرنے والوں کے لئے ہدایت ، رحمت اور بشارت ہے ۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (الاسراء: ۸۲)

"ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں

کے لئے تو شفا اور رحمت ہے۔"

آپؐ نے اس کتاب کی علمی اور عملی ایسی مفصل تشریح کی کہ اس کی کسی تعلیم کے بارے میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہ گیا۔ اور کتاب ہی کی طرح اس کی تشریح ــــ سنت ــــ اس طرح محفوظ ہوگئی کہ آج ۱۴سو سال گزرے کے باوجود نہ اس میں کوئی اشتباہ باقی رہا۔ نہ اس میں کوئی تشنگی باقی رہی۔ ایک انسان کو اپنی زندگی کے جس پہلو پر ہدایت کی ضرورت ہوتی اُس میں موجود پاتا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ (المائدہ: ۵۴)

"یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔"

ان دعاؤں، تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ جب خانۂ کعبہ کی تعمیر مکمل ہوگئی، تو حضرت ابراہیمؑ اس امانت کو اس کے امین حضرت اسمٰعیل کے سپرد کر کے اپنے مستقر کو واپس ہوئے۔ واپسی پر آپ نے جو الوداعی دعا مانگی، اُس میں اس گھر، اس سرزمین اور اس کو آباد رکھنے والوں کے لئے خیر و برکت کی بھر التجا کی۔

الوداعی دعا

دورانِ تعمیر آپ جو دعا مانگ چکے تھے وہ اتنی جامع اور ہمہ گیر تھی کہ بظاہر دوبارہ دعا مانگنے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی لیکن اگر غور کریں۔ تو اس کی حکمت صاف نظر آجاتی ہے۔

- اس کی پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے۔ کہ جب کام کی تکمیل ہوگئی۔ تو اس کا شکر ادا کرنا واجب تھا۔ شکر ادا کرنے کا پہلا اور بہترین قدم یہ ہے۔ کہ انسان اس منعمِ حقیقی کے سامنے سراپا سپاس بن جائے۔ کہ جس نے اس کام کو مکمل کرنے کی توفیق اور مہلت عطا فرمائی۔

- دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے۔ کہ انسان جس ہستی سے دعا مانگتا ہے وہ اتنی عظیم اور اتنی کریم ہے، کہ مانگنے والا ہر وقت یہ سمجھتا ہے کہ ابھی تک میں نے کچھ مانگا ہی نہیں ہے۔ اس کے سامنے جود و کرم کا ایک ایسا بحرِ ذخار ہوتا ہے۔ کہ طلب کرنے والا یہی سمجھتا ہے کہ میں نے ابھی صرف چند قطرے ہی مانگے ہیں۔

- تیسرے یہ کہ مانگنے والا اگر کسی موقع پر بھی یہ سمجھ لے کہ مجھے جو مانگنا تھا وہ مانگ لیا۔ تو دراصل یہ اُس منعمِ حقیقی کی ناقدری ہے جو دینے پر ہر وقت آمادہ ہے۔ ایسے داتا کے سامنے ہاتھ سمیٹ لینا ایک ایسی حرکت ہے جس کے ڈانڈے غرور و کبر سے جا ملتے ہیں۔

مکہ معظمہ کے لئے دعا

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، ابراہیمؑ نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے اور عرض کیا:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ:۱۲۶)

اور جب ابراہیم نے عرض کیا، "اے میرے رب! اس سرزمین کو پُرامن بنا اور اس کے رہنے والوں میں سے ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے، پھلوں کا رزق عطا فرما۔"

اس دعا کی معنویت

اس دعا کی معنویت اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم اپنے سامنے وہ ماحول رکھیں جس میں یہ دعا کی گئی تھی۔ بدویانہ زندگی کا یہ معمول ہے کہ طاقت ور قبیلہ کمزور قبیلے پر چڑھ دوڑے۔ راستے میں اگر کوئی قافلہ جا رہا ہو تو اس کو لوٹ لیا جائے، اور جو بچے، عورتیں اور مرد ہوں ان کو غلام بنا لیا جائے۔ جہاں سے مال ملنے کی امید ہو وہاں شبخون مارا جائے۔ ایسے علاقے میں امن و سکون کی امید رکھنا ایک خام خیالی کے سوا کچھ نہیں۔

عبادت کے لئے سکون و اطمینان شرطِ اولین ہے۔ جس گھر تک پہنچنے کے لئے زائرین کو راستے تک محفوظ نہ ملیں وہاں کے لئے رختِ سفر باندھنے کی کون ہمت کرے گا۔ اور اگر کسی نہ کسی طرح عبادت گاہ تک پہنچ بھی گئے تو ہر وقت دھڑکا لگا رہے گا کہ اب کوئی لوٹ مار کرنے والا گروہ آیا، اور اب آیا۔ ایسے ماحول میں نہ کوئی دل لگا کر یکسوئی سے عبادت کر سکتا ہے اور نہ وہ اطمینان سکون حاصل کر سکتا ہے جو یادِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ان سارے اندیشوں کے پیشِ نظر حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے یہ دعا مانگی کہ

"اے میرے رب، اس سرزمین کو پُرامن بنا۔"

تاکہ تیرے بندے، تیرا نام لینے کے لئے اطمینان وسکون سے آئیں، طمانیتِ قلب کے ساتھ تیری عبادت کرسکیں۔ اور سکون واطمینان کی دولت ساتھ لے کر واپس لوٹیں۔

حرمِ کعبہ کی برکات

اس دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے سرزمینِ حرم کو جو امن بخشا، اس کا یوں ذکر فرمایا:

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ۝ (العنکبوت: ۶۷)

"کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے ایک پُرامن حرم بنا دیا ہے، حالانکہ ان کے گرد وپیش لوگ اچک لئے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں۔ اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں۔"

سرزمینِ عرب میں کوئی مرکزی نظام نہ ہونے، بدویانہ قبائلی زندگی گزارنے اور منتشر گروہوں میں بٹے رہنے کی وجہ سے جو بدامنی پھیلی ہوئی تھی، وہ تاریخ کے اوراق میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ حرم ہی کی برکت تھی۔ کہ اس کی بدولت اس بدامنی کی ماری قوم کو کم از کم چار ماہ تو ایسے ملے جن میں کامل امن وسکون میسر آتا تھا۔

پھر خود اس گھر کی یہ شان تھی۔ کہ اس کی بدولت قاتلوں کو، برسوں کے دشمن کو بھی وہ امن مل جاتا تھا۔ کہ وہ حرم میں پہنچ کر اس طرح آزادانہ گھومتے پھرتے تھے کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھانے والا نہ تھا۔

اور اس ہی حرم کی بدولت قریش کو وہ سیادت اور پُرامن راہداری کے پروانے ملے کہ جس کی بدولت وہ پورے عرب میں محفوظ و مامون گھومتے پھرتے تھے۔ اور انھیں وہ ماحول میسر آتا تھا جس کی بنا پر ان کی تجارت چمکنے لگی۔ اس نعمت کا یوں ذکر فرمایا ہے:

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ۝ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۝ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ ۝ لا وَ

اٰمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ؏ (قریش: ۱-۴)

"چونکہ قریش مانوس ہوئے (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس، لہٰذا ان کو چاہیئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انھیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا، اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔"

یہ حرم کی تولیت ہی کی برکت تھی کہ اس زمانہ میں جب کہ کوئی قبیلہ شب خون کے خوف سے راتوں کو سو نہ سکتا تھا قریش کے قافلے آرام سے ہر جگہ سے گزر جاتے تھے اور کوئی انھیں ٹوکنے والا نہ تھا۔

پھر جس جگہ خانہ کعبہ بنایا گیا تھا وہ ایک پتھریلی، سنسان بنجر وادی تھی جہاں دور دور تک نہ سبزی تھی اور نہ کھیتی باڑی۔ اگر کوئی خوش قسمت انسان وہاں پہونچ بھی جائے تو کھانے پینے کی ہر چیز سے محروم رہ کر کتنے دن زندہ رہ سکے گا اور اگر بالفرض محال کوئی قافلہ کھانے پینے کی چیزیں بغرض تجارت لے بھی آیا، تو من مانے دام وصول کرے گا۔ ان ساری رکاوٹوں کے پیشِ نظر آپ نے مزید عرض کیا کہ:

"اس کے رہنے والوں میں سے جو لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں، انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما۔"

پھلوں کا رزق اس لئے مانگا۔ کہ اس غیر آباد جگہ میں چکی چولھا اور حضری لوازمات کہاں نصیب ہوں گے۔ پھل ہی ایسی چیز ہیں کہ آدمی پیسنے پکانے کے جھنجھٹ سے نجات پاکر اُن سے اپنا پیٹ اطمینان سے بھر سکتا ہے اور وہ توانائی بھی حاصل کر سکتا ہے جس کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔

رزق کے ساتھ ایمان باللہ اور آخرت کی شرط آپ نے اس بنا پر لگائی کہ اس سے پہلے جب آپ نے اپنی ذریت کے لئے "امامت الناس" کی دعا مانگی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ظالموں سے میرا کوئی وعدہ نہیں۔ یہ دعا مانگتے وقت آپ کے ذہن میں باری تعالیٰ کا ارشاد تازہ تھا، اس لئے آپ نے بربنائے احتیاط ایمان کی یہ شرط لگائی، لیکن اللہ تعالیٰ تقسیم رزق کے بارے میں کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

اس لئے فوراً ہی اس کی تصحیح کردی اور بتادیا کہ امامت دنیا اور تقسیم رزق دو علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں۔

بے شک امامت دنیا کے لئے ایمان باللہ و بالآخرت اور عمل صالح لازمی چیزیں ہیں لیکن جہاں تک رزق کا تعلق ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ بغیر حساب دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (البقرۃ:۲۱۲)

"اور اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب رزق دیتا ہے۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ (البقرۃ:۱۲۶)

"فرمایا، اور جو کفر کرے گا۔ اس کو ایک عرصے تک اس سے مستفیض ہونے دوں گا۔ پھر اس کو دوزخ کی آگ کی طرف دھکیل دوں گا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔"

یعنی رزق کی داد و دہش اس بات پر موقوف نہیں کہ کون ایمان والا ہے اور کون منکر ہے۔ وہ تو اپنے اُن دشمنوں کو بھی رزق دیتا ہے جو اسے دن رات گالیاں دیتے ہیں، اس کا انکار کرتے ہیں، اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں اور بسا اوقات یہ رزق اپنے باغیوں کو اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے، جتنا اپنے وفاداروں کو دیتا ہے۔ لیکن یہ انعام و اکرام ان کے لئے صرف اس دنیا کی زندگی تک ہے جہاں بغیر حساب رزق دیا جائے گا، لیکن جہاں حساب کتاب لیا جائے گا۔ وہاں ان تمام منکرینِ حق کا ٹھکانہ دوزخ کی بھڑکتی آگ ہوگی۔

دعائے خلیل کی اس مقبولیت کا مشاہدہ آج چار ہزار سال گزرنے کے باوجود کیا جا سکتا ہے۔ مکہ اور اس کے نواح میں آج جس کثرت سے پھل ملتے ہیں، حالانکہ وہاں کوئی باغ اور زراعت نہیں، جس طرح سے بہترین انواع و اقسام کے پھل دستیاب ہوتے ہیں، اور جس ارزانی سے ملتے ہیں، ان کو دیکھ کر بے اختیار خلیل اللہ کے حق میں

درود و سلام زبان پر آجاتا ہے - یہ اسی دعا کا صدقہ ہے کہ چار ہزار سال سے یہ فیض جاری ہے ـــــ روئے زمین سے بہترین پھل کھنچ کھنچ کر یہاں آتے ہیں - اور زائرین بیت اللہ کے دل و دماغ کو شاد کام کرتے ہیں -

امن کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی قبولیت اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ ہر زمانے حرم اور اس کا ماحول پر امن رہا - ایامِ جاہلیت میں جبکہ لوٹ مار، قتل و راہزنی عام تھی، اس گھر کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس خانہ جنگیوں اور بدامنی کی ماری ہوئی زمین کو ایسا امن دیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی -

- عمرہ اور حج کی وجہ سے ۴ ماہ تک ـ رجب، ذی القعدہ، ذی الحج اور محرم ـــــ راہگیروں، مسافروں اور زائرین کے لئے تمام راستے محفوظ رہتے، جنگیں بند رہتیں اور کوئی ان سے تعرض نہ کرتا -
- اگر کوئی شخص اپنے باپ یا بیٹے کے قاتل کو بھی حرم میں دیکھ پاتا تو اس کی جرأت نہ ہوتی کہ اس قاتل سے تعرض کرے -
- انسان تو انسان رہے، چڑیاں، جانور، پیڑ پتے تک اس گھر کی برکت سے محفوظ رہتے - اس سرزمین میں نہ تو کوئی شکار کرتا اور نہ پتوں کو توڑتا -
- آج ۴ ہزار سال گزر جانے کے باوجود اس گھر کی حرمت اور برکت کا یہ حال ہے - کہ ـــ جہاں دنیا کے ہر نام نہاد ترقی یافتہ ملک میں جرائم کا زور ہے، گلیوں اور سڑکوں پر قتل عام ہو رہا ہے ـــــ اس سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے وہ امن عطا کیا ہے کہ لوگ گھروں میں، دوکانوں میں، گوداموں میں تالہ تک لگانے کے روادار نہیں -
- طویل سے طویل راستے پر سیکڑوں میل سفر کیجیے، کوئی آنکھ تک اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا - آج اگر دنیا میں کہیں حقیقی طور پر امن پایا جاتا ہے - جہاں ہر شخص کی جان، مال عزت و آبرو محفوظ ہے تو وہ یہی خطہ ہے - اب اگر ان تمام مظاہر کو دیکھنے کے باوجود کوئی شخص اس گھر کی حرمت اور برکت کا قائل نہ ہو اور اسے دعائے خلیل کی قبولیت کے آثار نظر نہ آئیں - تو یہ تو اس کی آنکھوں کا قصور ہے -

تعمیرِ حرم کے تاریخِ عالم پر اثرات

تعمیرِ حرم حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا ایک اہم ترین اور زریں واقعہ ہے جس کے مختلف پہلوؤں پر قرآن حکیم میں تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ کعبۃ اللہ کی تعمیر سے تہذیب انسانی کو کیا کیا برکات حاصل ہوئیں، تاریخ عالم پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اہلِ ایمان کو اس سے کیا فائدے حاصل ہوئے، اسلام کے دائرے کو اس سے کیا وسعت حاصل ہوئی، اس کے مادی اور روحانی فوائد کیا ہیں؟ ان سب کا انشاءاللہ ہم یہاں تفصیلی ذکر کریں گے، تاکہ جس کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ (آل عمران: ۹۷)

"اُس میں کھلی کھلی نشانیاں اور مقام ابراہیم ہے۔"

اُس کی پوری تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے اور اُس کی ہم وہ دائمی قدر منزلت کرسکیں جس کا وہ مستحق ہے۔

پہلا مقامِ عبادت

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۝ (آل عمران: ۹۶)

"بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لئے مرکزِ ہدایت بنا دیا گیا تھا۔"

طوفانِ نوحؑ کے بعد اولادِ نوحؑ دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہوگئی۔ اس کو مجمع

اور متحد کرنے والی کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اس کو ایک مرکز پر متفق کر دیتی۔ ٹکڑوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی اس دنیا کو اللہ نے حرم کی شکل میں ایک ایسا مرکز عطا کیا جس پر مشرق و مغرب شمال و جنوب کی تمام اقوام کو مجتمع کر دیا۔ یہ دنیا میں وہ پہلا مرکز تھا جس پر اقوام عالم اکٹھی ہو سکتی تھیں اور ہوئیں۔ یہیں سے وہ پہلی عالم گیر تحریک پھیلی جس نے وحدت الٰہ اور وحدتِ انسانیت کا درس دیا اور اس کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔

عالم گیر اجتماع

پھر یہ اجتماع کسی خاص نسل، کسی خاص مفاد اور کسی دھڑے بندی کی بناء پر نہیں ہوا بلکہ خالص ہدایتِ خداوندی کی بنیاد پر ہوا۔ توحید باری تعالیٰ کی شمع یہاں پر جگمگائی اور ہر سمت سے شمع توحید کے پروانے اس کی طرف دوڑتے ہوئے آنے لگے اور ہدایتِ ربانی سے مالا مال ہونے لگے، اسی لئے فرمایا:

هُدًى لِّلْعَالَمِينَ "اور اس میں ہدایت ہے تمام جہان والوں کے لئے۔"

آیاتِ بیّنات

پھر فرمایا:

"اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ اور ابراہیم کا مقامِ عبادت ہے۔"

وہ کھلی ہوئی نشانیاں کیا ہیں؟

- پہلی یہ کہ منتشر گروہوں میں بٹی ہوئی دنیا کو ایک مرکز ہدایت نصیب ہوا۔
- دوسری یہ کہ شرک و گمراہی میں ڈوبی ہوئی دنیا کو منبع ہدایت و توحید نصیب ہوا۔ جہاں لوگوں کو لاتعداد خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدائے واحد کا دامن پکڑنا نصیب ہوا۔
- تیسری یہ کہ اس ایک گھر کی وجہ سے ایک سنسان، غیر آباد، بے آب و گیاہ سر زمین کو ایک ایسا تجارتی مرکز مل گیا۔ جہاں سال کے ہر دن میں رونق رہتی اور دنیا بھر کے لوگ آکر ملتے، رہتے اور بستے۔ اور اس گھر کی برکت ہی سے وہ معاشی فارغ البالی میسر آئی جو تجارتی سرگرمیوں کا ثمرہ ہے۔

عالمی برادری کی تاسیس

○ ایک ایسی عالمی برادری بننے کے مواقع اور بنیادیں پائیں جو نہ کسی نسل، نہ کسی نسب نہ کسی رنگ، نہ کسی زبان، نہ کسی علاقہ پر مبنی تھی، بلکہ خالص ایک نظریہ اور ایک نصب العین سے تشکیل پاتی ہے، وہ نظریہ و نصب العین ہے:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ "اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔"

بین الاقوامی مرکزِ عبادت

○ ایک ایسا مرکز عبادت ملا جو دنیا کے ہر خطہ میں رہنے والے کو اپنی ہی طرف متوجہ کر لیتا ہے مشرق کا رہنے والا ہو، یا مغرب کا، شمال کا رہنے والا ہو یا جنوب کا، ہر سمت اور ہر مقام کا رہنے والا اس ہی طرف کا رُخ کر کے اپنی عبادت انجام دیتا ہے۔ اس طرح سمتوں اور مقاموں کے اختلاف کے باوجود ایک مرکز پر مجتمع ہو جاتے ہیں۔

ہر شے کے لیے مامن

○ ایک ایسا مامن ملا، کہ جس کی برکت سے نہ صرف یہ کہ حرم میں ہی ہر ایک کو اپنی جان و مال، عزت و آبرو کی پناہ ملی بلکہ اس کی برکت سے سال کے چار مہینوں میں دور دراز کے راستے مامون و محفوظ ہو گئے۔ اور ہر ایک کو کم از کم سال کا ایک تہائی حصہ کامل امن و امان کے ساتھ گزارنے کا موقع مل گیا۔ اسی لئے رب العالمین نے فرمایا:

وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۝ (البقرہ: ۹۷)

"جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔"

حرم کی اس فضیلت و برکت کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ یوں بیان فرمایا:

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ (البقرہ: ۱۲۵)

"اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنا لو۔"

نعمتِ حج

کعبۃ الحرام کو جب اللہ تعالیٰ نے یہ مرکزیت و حیثیت عطا کی۔ تو اس کو برقرار رکھنے کے لئے اور قیامت تک کے لئے اس کا فیض جاری رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب اس کی زیارت کے لئے "حج" کا اعلان عام کر دو۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝ (الحج: ۲۷)

"اور لوگوں کو حج کے لئے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل چل کر اور اونٹوں پر سوار آئیں۔"

اور اس اعلانِ عام کے ساتھ اس کو ایک ایسا فریضہ قرار دیا کہ جو شخص استطاعت کے باوجود اس گھر کی زیارت نہ کرے تو اللہ کی نظر میں اُس نے کفر کا ارتکاب کیا۔ ارشاد ہوا:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (آل عمران: ۹۷)

"اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے (کفر) تو اُسے معلوم ہو جانا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

اسی کی تشریح میں حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتا تو اللہ کو اس کی پروا نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔"

یعنی مسلمانی کی علامت یہ ہے کہ اگر اللہ نے ذرائع وسائل دیئے ہیں اور کوئی ایسا مانع بھی موجود نہیں، جیسے شدید بیماری، خانہ جنگی، مالی زیر باری، تو وہ حج بیت اللہ کرے ورنہ اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا انجام یہود و نصاریٰ سے مختلف نہ ہو گا۔ اعلانِ حج کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اہتمام فرمایا کہ حج کی وہ روح اور بنیاد پوری طرح باقی رہے جس پر اس کو قائم کیا گیا تھا، ارشاد ہوا:

پاکیزگی حرم

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ (الحج: ۲۶)

"یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع اور سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔"

یعنی اس مبارک گھر کی پاکیزگی و صفائی کے لئے دوہرا انتظام فرمایا۔

○ ایک یہ کہ اس کو ہر طرح کی گندگی و ناپاکی سے پاک و صاف رکھا جائے اور اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام فرمایا کہ اس کی طرف رُخ کر کے بول و براز کرنا بھی ممنوع قرار پایا۔

○ دوسرے یہ کہ اس کو ہر قسم کے شرک کی آلودگی سے پاک رکھا جائے۔ خدائے واحد کے سوا یہاں کسی کا کوئی کلمہ بلند نہ ہو اور اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

اس بارے میں اللہ نے صرف عام ہدایت پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ معماران حرم سے عہد لیا کہ اس کی ہر طرح کی پاکیزگی کا اہتمام والتزام کریں گے۔ فرمایا:

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ (البقرۃ: ۱۲۵)

"اور ہم نے ابراہیم و اسمٰعیل کو ہدایت کی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔"

حرام مہینے ——— حج کے لئے پرامن زمانہ

پھر اس گھر تک پہونچنے کے لئے اوقات و ماہ مقرر فرمائے۔ اور اس کے لئے ضابطے مقرر فرمائے، ارشاد ہوا:

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ

الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ط (المائدہ: ۹۷)

"اللہ نے مکان محترم، کعبہ کو لوگوں کے لئے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہِ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اس کام میں معاون بنا دیا۔)

ماہ رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرّم کو اس غرض کے لئے حرام ٹھہرایا کہ ان مہینوں میں لڑائی کی جائے یا جنگ چھیڑی جائے۔ اس پابندی کی وجہ سے زائرین اور قافلوں کے لیے ایک ایسا موسم امن عطا کیا جس میں ہر شخص کی جان و مال محفوظ رہے۔ دوسری جگہ ان پُرامن مہینوں کے متعلق قواعد و ضوابط بنائے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ط قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ط وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ق وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ج وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ○

(البقرہ: ۲۱۷)

"لوگ پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو، اس میں لڑنا بہت بُرا ہے۔ مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا، اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا، اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا ہے، اور فتنہ خوں ریزی سے شدید تر ہے۔"

ان آیات نے حرام مہینوں کی حرمت ثبت کر دی لیکن ساتھ ساتھ اس کی حقیقت بھی بتا دی کہ گو ان مہینوں میں جنگ و جدال کی باتیں کرنا بڑے گناہ کی بات ہے، اور ان مہینوں میں امن ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ کیسا امن ہے کہ اس بیت الحرم کے طفیل اللہ کے باغی اور سرکش محفوظ و مامون دندناتے پھریں، لیکن خود اس گھر کے مالک، خدا کے فرمانبردار بندے اس کے گھر میں بھی پناہ حاصل نہ کر سکیں۔ اس لئے یہ حالت امن نہیں حقیقی امن یہ ہے کہ خدا کے بندے، خدا کی زمین پر، خدا کی بندگی کرنے میں آزاد ہوں اور ان کی جانیں بھی اسی

طرح محفوظ و مامون ہوں جس طرح یہ مدعیانِ امن اپنی جانوں کا تحفظ حاصل کرتے ہیں۔
دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ط فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ (البقرہ: ۱۹۴)

"ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہی ہے اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا۔ لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے، تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو! البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔"

یعنی حرمت اس لئے قائم کی گئی ہے کہ اللہ کے بندے، اللہ کی عبادت کے لئے، اللہ کے گھر تک بآسانی اور محفوظ و مامون پہنچ سکیں۔ اب اگر اللہ کے بندوں کا یہ بنیادی حق ہی سلب کر لیا جائے، تو پھر ان مہینوں کی حرمت کہاں باقی رہی۔ اس لئے اگر کفار ان مہینوں کی حرمت کو بالائے طاق رکھ دیں تو اللہ کے بندوں کو بھی حق ہے کہ ایک گال پر چانٹا کھانے کے بعد دوسرا گال پیش کرنے کے بجائے، اُس ظلم و زیادتی کا پورا پورا جواب دیں جو ان پر روا رکھا گیا ہے، چاہے یہ فعل ان مہینوں ہی میں کیوں نہ کیا گیا ہو۔

حیلہ جو طبیعتوں نے ان مہینوں کی حرمت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے ایک نیا حربہ اختیار کیا۔ اور وہ یہ تھا کہ جب وہ ان مہینوں میں کسی فرد یا قبیلہ پر زیادتی کرنا چاہتے تھے تو ان مہینوں کو بدل لیا کرتے تھے کبھی سال میں ۱۲ ماہ کی بجائے ۱۳ ماہ کر لئے اور کبھی ۱۴ ماہ کر لئے۔ اس طرح ان مہینوں کو تبدیل کر کے ان میں اپنے مخالفین سے انتقام لے لیا کرتے تھے۔ اس کو "نسی" کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس حیلہ جوئی کا بھی راستہ بند کیا اور فرمایا:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ

الْقَيِّمُ ۵ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ (التوبة ۹: ۳۶-۳۷)

"حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے، اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے، اور ان میں سے چار مہینے حرام ہیں یہی ٹھیک ضابطہ ہے، لہٰذا ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو، جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔ اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔ نسی تو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت ہے جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا کئے جاتے ہیں کسی سال ایک مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر دیتے ہیں، تاکہ اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری بھی کر دیں اور اللہ کا حرام کیا ہوا حلال بھی کر لیں۔"

ہدی کی حرمت

پھر قربانی کے جانوروں کو قربانی سے پہلے پکڑنے، ذبح کرنے، اور ستانے سے روک دیا۔ نشانی کے طور پر ان کے گلوں میں پٹے ڈالنے کا حکم دیا تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ یہ حج کی قربانی کے جانور ہیں اور ان کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔

تکمیلِ امن

پھر اس حالتِ امن کی ایسی تکمیل کی کہ اس میں ہر قسم کے جھگڑے حتیٰ کہ تلخ کلامی تک کو ممنوع قرار دیا۔ اور انسان تو انسان، گھاس پتی، کیڑے مکوڑوں تک کو مارنے سے منع کر دیا۔ ارشاد ہوا:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا

فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ط
وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ز وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ○
(البقرہ: ۱۹۷)

"حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقررہ مہینوں میں حج کی نیت کرے
اسے خبردار رہنا چاہیئے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل،
کوئی بدعملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔ اور سب سے بہتر زادِ
راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوشمند! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔"

یہاں پر حج کے مہینوں کی تصریح نہیں کی کیونکہ حج کے مہینے ہر ایک کو معلوم و معروف تھے۔ ۹ ذی الحجہ کو قیامِ عرفات ہے جو حج کا اصل رکن ہے۔ اس دن مقامِ عرفات پر اللہ کے حضور پیش ہونے کے لئے ظاہر ہے کہ لوگ پہلے سے سفر کریں گے اور حج ادا کرنے کے بعد واپس ہوں گے۔ اس لئے حج کے واسطے ۳ ماہ مخصوص فرمائے، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرّم۔ اب جو شخص اس مبارک سفر کے لئے گھر سے نکلے، اس کو حج کے ضابطے اور قواعد بھی بتا دیئے، تاکہ وہ اس طول طویل سفر سے پوری طرح مستفید ہو سکے اور اُس جذبہ سے سرشار ہو کر گھر واپس لوٹے جس کو بیدار اور پیدا کرنے کے لئے اس عبادت کو فرض قرار دیا ہے اور اس کو اسلام کا ایک رکن قرار دیا ہے۔

سفرِ حج کے ضابطے

شہوانی باتوں سے مکمل اجتناب

اس مبارک اور پاکیزہ سفر کے لئے پہلا ضابطہ جو مقرر کیا گیا، وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شہوانی فعل یا بات سرزد نہ ہو حج کے زمانے میں اکثر انسان اپنے گھروں سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور ایک اجنبی ماحول میں ہوتے ہیں، جہاں انھیں کوئی جاننے والا نہیں ہوتا، پھر وہاں مرد و زن کے مخلوط اجتماعات ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ایسے مواقع کثرت سے موجود ہوتے ہیں جن میں انسان پھسل جائے اور حرکات شنیعہ میں مبتلا ہو جائے۔ اس لئے اُسے پہلے قدم ہی پر روک دیا گیا کہ وہ اس سفر کا تقدّس برقرار رکھنے کے لئے کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے اس پر آنچ آتی ہو۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ اس سفر میں شہوانی حرکات سے روک دیا گیا بلکہ ایسی گفتگو سے بھی منع کر دیا گیا ہے، جس سے شہوانی جذبات میں تحریک پیدا ہوتی ہو۔ دوسری عورتوں کو دیکھنا اور گھورنا ویسے بھی ممنوع ہے لیکن سفر حج میں خاص طور پر منع کیا گیا، تاکہ قلب و نظر کی پاکیزگی پوری طرح برقرار رہے۔

نافرمانی سے مکمل احتراز

دوسرا ضابطہ یہ مقرر کیا گیا کہ اتنے دُور دراز مقام کا، صعوبتوں کا سفر انسان اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس کو اللہ نے فرض قرار دیا ہے اور وہ محض اللہ کے حکم کی تعمیل میں یہ سفر اختیار کر رہا ہے۔ اس لئے اُسے اس راہ میں نافرمانی کے ہر شائبے سے بچنا چاہیے۔ مہینوں کی مشقت اٹھا کر، ہزاروں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی اگر آدمی اسی طرح کورا واپس آئے جس طرح گیا تھا تو اس سے زیادہ بدنصیبی کیا ہو گی۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، ہزاروں شکلیں ہو سکتی ہیں جن کو گننا اور فہرست بنانا ناممکن نہیں،

اس لئے یہاں صرف ایک جامع ہدایت دے کر اس کو محتسب دل کے حوالے کر دیا گیا۔ انسان کا سب سے بڑا محتسب تو اس کا ضمیر اور دل ہے۔ کوئی اُسے دیکھے یا نہ دیکھے، ہر قدم پر اس کا دل اُسے بتاتا ہے کہ یہ کام صحیح ہے اور یہ غلط۔ ہر انسان خود ہی اس بات کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے کہ جو کام وہ کر رہا ہے گناہ کی تعریف میں آتا ہے یا ثواب کی۔ اس ہی حقیقت کو نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یوں بیان فرمایا:

آپ سے پوچھا گیا کہ گناہ کیا ہے؟

آپ نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ "تو اپنے دل سے پوچھ لے"۔ دوسری جگہ گناہ کی حقیقت بتاتے ہوئے فرمایا:

مَاحَاكَ فِي صَدْرِكَ "جو تیرے دل میں کھٹکے۔"

اس ہی لئے یہ ہدایت کی گئی۔ کہ اتنا مال و زر خرچ کر کے جس جنس گرانمایہ ——اللہ کی رضا —— کو حاصل کرنے کے لئے یہ سفر اختیار کیا ہے اس کو یوں چھوٹی بڑی نافرمانیوں میں مبتلا ہو کر ضائع نہ کرو۔ شریعتِ الٰہی نے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کی نشاندہی کر دی ہے، اب تو ہی فہرست بنا اور اس سے پرہیز کر۔

كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ○ (الاسراء: ۱۴)

"آج تیرا نفس ہی اپنا حساب لینے کے کافی ہے"

جھگڑوں سے پاک

تیسرا ضابطہ یہ مقرر کیا کہ اس مبارک سفر کے دوران کسی قسم کا جھگڑا نہ کیا جائے؛ حتیٰ کہ کسی کو دھکا دینا، ٹھوکا دینا، جھڑکنا۔ ڈانٹ ڈپٹ کرنا، غصہ کی ہر شکل کا اظہار کرنا ممنوع قرار پایا۔ اس کا خاص طور پر ذکر کرنے کی ضرورت اس لئے پیدا ہوئی کہ حج کے موقع پر خلقت کا عظیم اژدھام ہوتا ہے، ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ وہ تمام مناسک سے جلد از جلد فارغ ہو کر اس زمرۂ پاک باز اں میں —— جن کو حاجی کہتے ہیں —— شامل ہو جائے۔ اسی جذبۂ کشاکش میں وہ کبھی طواف کرتے وقت دوسروں کو چیرتا پھاڑتا، پھلانگتا ہوا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی دوسروں کو دھکا

دے کر اپنا راستہ بناتا ہے کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر کے اپنا حق حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ اور کبھی دوسروں کو کچل کر اپنے جذبۂ بیتاب کی تکمیل کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھنا چاہتا ہے منیٰ میں رمی جمار، عرفات کے لئے کوچ اور وہاں سے واپسی، مزدلفہ میں قیام، خانۂ کعبہ میں طواف کے لئے جس عجلت اور جلد بازی کے مظاہرے کے مواقع ہوتے ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا کہ زائرین بیت اللہ کو امن، سکون، وقار اور طمانیت کا درس دیا جائے، تاکہ ہر شخص مناسک کو اطمینان و خوبی کے ساتھ ادا کر سکے ۔ اس لئے ہر اس فعل کی ممانعت کر دی گئی جو کسی کی دل آزاری کرے، تحقیر کرے، تکلیف پہنچائے ۔ اور محض زور و طاقت کے بل پر کوئی آگے بڑھ سکے ۔

تقویٰ

آخر میں ایک ایسی جامع و مانع ہدایت دی جو مندرجہ بالا تمام ہدایتوں پر محیط بھی ہے اور ان سب کی جڑ بھی ہے، فرمایا:

"سفرِ حج کے لئے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیزگاری ہے ۔"

ایک حج ہی پر کیا موقوف ہے، تمام نیک کاموں کی اصل بنیاد یہی تقویٰ ہے ۔ اگر تقویٰ نہ ہو تو تمام کاموں کی ظاہری شکل رسم و رواج سے زیادہ نہیں ۔ تقویٰ جسم کی روح کے مانند ہے اور تمام کاموں کی ظاہری شکلیں لباس کے مانند ہیں ۔ ایک جسم کو آپ کتنے ہی اچھے کپڑے پہنا دیں، لیکن اگر اس میں روح نہیں تو وہ ایک لاش ہی ہے جو جلد ہی گل سڑ جائے گی ۔

تقویٰ جس کی یہ اہمیت ہے، کیا چیز ہے؟ یہ خدا کا خوف ہے جو ایک مومن کے رگ و پے میں جاری و ساری ہوتا ہے ۔ ایک ایک قدم پر اور ایک ایک حرکت پر یہ نظر رکھنا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کے مطابق ہے یا نہیں، اپنے ہر کام میں مسئولیت کا اہتمام کرنا کہ ان تمام کاموں پر اللہ کے سامنے جواب دینا ہے ۔ اور پھر اللہ کے خوف سے تمام غلط کاموں سے دست بردار ہو جانا اور نیک اعمال کو اختیار کرنا

چاہے ان کا نتیجہ فوراً ظاہر ہو یا نہ ہو، تقویٰ ہے۔

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ (النّٰزعٰت: ۴۰۔۴۱)

"اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا، بس اس کا ٹھکانا جنت ہے۔"

آج ایسے کتنے لوگ ہیں جو حج کے لئے جاتے ہیں اور اس زادِ راہ کو ساتھ لے جاتے ہیں؟ کتنے ہی لوگ ہیں جنھیں دیکھا ہے کہ اپنا حج اور تقویٰ ایرپورٹ یا بندرگاہ ہی پر چھوڑ آتے ہیں۔ معمولی معمولی چیزوں کو کسٹم سے چھڑانے کے لیے چھپانا، جھوٹ بولنا، رشوت پیش کرنا معمول بن گیا ہے۔ کیا اسی لئے ہزاروں روپے خرچ کر کے اور اور مہینوں کا پرصعوبت سفر اختیار کر کے ان ہی معمولی چیزوں کو لینے جاتے ہیں؟ کاش ہم کبھی اس پر غور کرتے۔

پھر حج میں اخلاقِ فاضلہ کی افزائش کے لئے جس زبردست ٹریننگ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس سے ہم کوئی فائدہ اٹھاتے ہیں؟ حج کا پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی اپنے غصہ پر قابو پائے، ایثار اور قربانی کا درس سیکھے، دوسروں کو آرام پہنچانے کے لئے خود تکلیف اٹھائے اور پیشانی پر بل نہ لائے۔ نہ کسی کو دھکا دے، نہ کسی سے تلخ کلامی سے پیش آئے، نہ دھینگا مشتی کرے، لیکن کتنے لوگ ہیں جو اسے اپنی زندگی میں اپناتے ہیں اور عام حالات میں ان مکارم اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں؟

حج کی ترتیب

حج کی فرضیت، اس کی اہمیت، اور اس کے فوائد کے بعد اب مختصراً اس کی ترتیب بھی سمجھ لیجئے، تاکہ اسلام کے اس پانچویں رکن کی مکمل تصویر سامنے آجائے۔

خانۂ کعبہ کی تعمیر کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ حج کے لئے لوگوں میں منادی کردیں۔ کہ اس گھر کی زیارت کے لئے تمام اصحابِ استطاعت اہل ایمان آئیں۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ○ (الحج: ۲۷)

"اور لوگوں کو حج کے لئے اذنِ عام دے دو۔ کہ وہ تمہارے پاس ہر دُور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں۔"

اسی پکار کے جواب میں چار ہزار سال سے مسلسل، دنیا کے ہر کونے سے اہل ایمان اپنے مرکزِ ایمان کی طرف سمٹ سمٹ کر آتے ہیں۔ دولتِ ایمان ویقین سے مالا مال ہو کر اور بخششِ رب سے جھولیاں بھر بھر کر اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔

احرام و تلبیہ

جو شخص حج کا ارادہ کرتا ہے، وہ نہا دھو کر، پاک صاف ہو کر اپنے گھر سے نکلتا ہے اور ایک خاص حد پر جس کو میقات کہتے ہیں۔ اپنا لباس تبدیل کرتا ہے۔ یہ میقات چاروں سمت سے آنے والوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مقرر کی گئی ہیں۔ یہاں پہنچ کر زائر احرام باندھتا ہے۔ جو ایک سادہ بے سلی چادر اور ایک تہمد پر مشتمل ہوتا ہے۔ احرام باندھنے کے بعد حاجی اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے داعیٔ اعظم حضرت ابراہیمؑ کی پکار

کا جواب دے؛ چنانچہ وہ پکار پکار کر کہتا ہے:

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ ، اِنَّ الْحَمْدَ
وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ ، لَا شَرِيْكَ لَكَ ۔

"حاضر ہوں، میرے اللہ حاضر ہوں۔ حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں
حاضر ہوں۔ یقیناً تعریف صرف تیرے ہی لئے ہے۔ نعمت سب تیری ہے
اور ساری بادشاہی تیری ہے ۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے ۔"

خدائی پکار پر لبیک کہنا اور تعمیلِ ارشاد کے لئے دوڑ پڑنا ہی تو اصل ایمان ہے۔
حج کیا ہے؟ تعمیلِ ارشاد کے دوڑ پڑنے کی مشق ۔

منیٰ میں کیمپ

اس کے بعد ۸ ذی الحج کی صبح کو منیٰ کے میدان میں پڑاؤ ڈالنا اور کیمپ کی زندگی کا آغاز کرنا، خدا کے حکم کی تعمیل میں گھر بار سب کچھ چھوڑ کر عیش و آرام ہر چیز کو قربان کر دینے کے عزم کا اظہار ۔

وقوفِ عرفہ

۹ ذی الحجہ کو منیٰ سے میدانِ عرفات کی جانب کوچ کرنا اور پھر وہاں سے مغرب کے وقت مزدلفہ کو واپس ہونا ۔ اور پھر یہیں رات بسر کرنا ۔

مزدلفہ میں شب گزاری

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ
مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا
هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ ثُمَّ اَفِيْضُوْا
مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ○ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ
اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي
الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ○ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ نَصِیۡبٌ مِّمَّا کَسَبُوۡا ؕ وَاللّٰهُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ○

(البقرۃ: ۱۹۸ - ۲۰۲)

"اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر جب عرفات سے چلو تو مشعر الحرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو، جس کی ہدایت اس نے تمہیں دی ہے۔ یقیناً اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو۔ یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح پہلے اپنے آباء و اجداد کا ذکر کرتے تھے، اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ (مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دیدے۔ ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب، ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا! ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔"

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حج کی ترتیب بھی بیان کی ہے، کچھ خرابیوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصلاح بھی فرمائی ہے اور اس کے کچھ مناسک کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

ترتیب کے متعلق فرمایا:

"پھر جب عرفات سے چلو، تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو۔ اس طرح سے یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں دی ہے، ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ

بھٹکے ہوئے تھے ۔

پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو، یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے ۔

پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے اُس طرح اب اللہ کا ذکر کرو، بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر ۔ "

یہاں اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے ۔ کہ یوم عرفہ (۹ ذی الحج) سے پہلے ۸ ذی الحج کو منیٰ میں ٹھہرو اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ یوم عرفہ کون سا دن ہے اور کس وقت پہنچنا چاہیئے۔ نہ یہ بتایا گیا ہے کہ مزدلفہ میں کب پہنچنا چاہیئے اور وہاں سے دوبارہ منیٰ کو کب واپس جانا چاہیئے ۔ اور نہ یہ ہی بتایا گیا ہے ۔ کہ قربانی دس ذی الحجہ کو دی جائے ۔

- بس مجمل طور پر اشارہ کر دیا ۔ کہ پہلے عرفات سے واپس ہو،
- پھر مزدلفہ میں ٹھہرو،
- پھر وہاں سے واپس ہو کر ارکان حج مکمل کرو،
- اور اللہ کے ذکر کا اہتمام کرو ۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مکہ میں ڈھائی ہزار سال سے متواتر حج ادا کیا جاتا رہا تھا، اس لئے ان سب باتوں سے لوگ آگاہ تھے ۔

دوسری وجہ یہ ہے : کہ اللہ تعالیٰ نے صرف کتاب نازل نہیں فرمائی بلکہ اس کے ساتھ رسول ؐ بھی مبعوث فرمایا ۔ کتاب مجمل طور پر اصول بیان کرتی ہے اور رسول ؐ اُن کی تشریح و تفصیل بیان کرتا ہے اور ان پر عمل کر کے دکھاتا ہے ۔ یہیں پر ان لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو رسول ؐ کو چھوڑ کر قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں اور سنت کو دین سے کاٹنا چاہتے ہیں ۔ کیا کوئی شخص سنت رسول ؐ سے صرف نظر کر کے مندرجہ بالا آیات سے احکام حج معلوم کر سکتا ہے ؟ کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ کہاں سے پلٹنے کا حکم دیا ہے اور پلٹنے کے بعد ذکر خدا کی کیا شکل مقرر کی ہے ؟ دراصل ایسے ہی وہ مقامات ہیں ۔ جہاں سے حضرت ابراہیم ؑ کی اس دعا کی معنویت نظر آتی ہے کہ :

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

(البقرۃ: ۱۲۸)

"اے ہمارے رب، ہمیں اس کے مناسک دکھا اور ہم پر متوجہ ہو، بیشک تُو توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مناسک کی تعلیم دی۔ اور اللہ کے نبی نے امت کو ان مناسک کی تعلیم دی۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ہو سکے کہ عبادت حج کو ادا کر سکیں۔ یہی دوسری عبادات کا حال ہے۔

پھر اس ہی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی کہ:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

(البقرۃ: ۱۲۹)

"اے ہمارے ربّ، ان کے درمیان ان ہی میں سے ایک ایسا رسول اٹھا جو ان کے سامنے تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے جواب میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرمایا۔ جو قریش ہی میں سے تھے۔ آپ نے لوگوں تک اللہ کا پیغام پہونچایا، اس پیغام کے رموز و مضمرات بیان فرمائے، ان پر عمل کر کے ہر ایک حکم کی عملی تشریح کی اور اس طرح دین پر مکمل عمل کرکے ان کی زندگیوں کا تزکیہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی اس دعا کی قبولیت کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کو مومنین پر احسانِ عظیم بتایا ہے کہ اس دعا کی قبولیت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرمایا، تاکہ ان امورِ نبوت کو انجام دے کر لوگوں کی زندگیوں کو پاکیزہ بنائیں اور سنواریں، ارشاد ہوا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (آل عمران: ۱۶۴)

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔ یقیناً اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کردہ ترتیب حج

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی جو ترتیب سکھائی وہ یہ تھی۔

۱۔ ۸ ذی الحج کو احرام باندھ کر صبح ہی منیٰ پہونچا جائے اور ایک دن رات وہیں ٹھہرا جائے۔

۲۔ ۹ ذی الحج کو نماز فجر کے بعد منیٰ سے روانہ ہو کر عرفات زوال سے پہلے پہونچ جائے۔ اور وہاں اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرے۔

۳۔ ۹ ذی الحج کو مغرب کے وقت روانہ ہو اور رات مزدلفہ میں بسر کرے۔ اور اس رات کو محض خواب و آرام میں نہ گزار دے بلکہ وہاں بھی اللہ کو یاد کرے اور بخشش طلب کرے۔

۴۔ ۱۰ ذی الحج کو فجر کی نماز پڑھ کر مزدلفہ سے منیٰ کے لئے واپس روانہ ہو اور وہاں پہنچ کر پہلے قربانی کرے۔ پھر نہا دھو کر حجامت بنوا کر احرام اتارے اور کپڑے بدلے۔

۵۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحج تک رمی جمار کرے۔

۶۔ ۱۰ ذی الحج کو اس سے فارغ ہونے کے بعد مکہ معظمہ میں بیت اللہ جا کر حاضری دے، وہاں طواف کرے اور سعی کرے۔ جس گھر تک پہنچنے کی آرزو لے کر اس دور دراز سفر کو اختیار کیا تھا، اس گھر پر پہنچنے کے بعد اس نعمت کا شکر ادا

کرے، اور اللہ کی بخشش عام سے جھولیاں بھر کر پھر منیٰ میں واپس آئے۔ یہی وہ سعادت ہے جس کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا:

"حج مبرور کا صلہ تو بس جنت ہی ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ

"جس نے اللہ کے لئے حج کیا اور اس میں شہوت اور فسق و فجور سے پرہیز کیا، وہ اس طرح پلٹا جیسے آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔"

اصلاحاتِ حج

حج کے سلسلے میں لوگوں نے جو تصورات گھڑ رکھے تھے اور دین و دنیا کو الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا تھا، اُن سب کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ دین و دنیا علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں۔ وہ تمام کام جو خالص دنیاوی کام شمار ہوتے ہیں اگر اللہ کے بنائے ہوئے حدود کے اندر انجام دیئے جائیں تو سب دین ہی میں شمار ہوں گے۔ مثلاً:

تلاشِ رزق کی اجازت

۱۔ لوگ سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کہ پیٹ بھرنے کے لئے روزی کمانا خالص دنیاوی کام ہے، عبادت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے کنارہ کشی کی جائے۔ لیکن اللہ نے فرمایا نہیں، ایسا نہیں۔

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّکُمْ (البقرہ: ۱۹۸)

"اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے روزی تلاش کرنے کو اپنا فضل قرار دیا۔ اور حج جیسی زاہدانہ عبادت کے ساتھ اس کی اجازت دے کر اس کا مرتبہ بڑھا دیا۔

۲۔ قریش اپنے آپ کو مراعات یافتہ طبقہ سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز گردانتے تھے، اس امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے انھوں نے میدانِ عرفات جانا چھوڑ دیا تھا اور مشعرِ حرام (مزدلفہ) سے ہی واپس آجاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس غرور و پندار کو توڑا اور حکم دیا ۔

"پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں ، وہیں سے تم بھی پلٹو ۔ "

اور بتا دیا کہ اللہ کی جناب میں سب انسان برابر ہیں ۔ تم میں یہ کون سا سرخاب کا پر ہے کہ مناسک حج میں بھی کتر بیونت کر کے اپنے کبر و غرور کے اظہار کے لئے راستے نکالو ۔

شاعری کے دنگل ممنوع

۳ ۔ عرفات سے واپسی کے بعد یہ لوگ مزدلفہ اور منیٰ میں شاعری کے دنگل منعقد کرنے لگے تھے ۔ باپ دادا کے کارناموں پر بے سروپا فخر و مباہات کا اظہار کرتے تھے ۔ اور خوشامد و تملق کا ماحول برپا کرتے تھے ۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ مقام تو صرف اللہ ہی کا ہے کہ تعریف کی جائے تو اس ہی کی کی جائے ۔ اور صرف اس ہی کی ذات اس کی مستحق ہے کہ اس کے ہی گن گائے جائیں ۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ط (البقرہ : ۲۰۰)

" اور پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو ، تو پہلے جس طرح اپنے آبا و اجداد کا ذکر کرتے تھے اُس طرح اب اللہ کا ذکر کرو ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ۔ "

خود ساختہ عبادتوں کے طریقوں کی ممانعت

۴ ۔ لوگوں نے اپنی اپنی خواہشات کے مطابق اللہ کی عبادت کے لئے بے شمار طریقے اختیار کر لئے تھے ۔ کوئی بتوں کو پوجتا تھا ، کوئی چپ رہنے کی قسم کھا لیتا تھا ، کوئی مسلسل روزے رکھنے کی نیت کر لیتا تھا ، کوئی ناچ گا کر خدا کو یاد کرنے کا فرض ادا کرتا تھا ۔

اللہ تعالیٰ نے ان سب کو گمراہی قرار دیتے ہوئے فرمایا ۔

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ج وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ○

" اللہ کو یاد کرو اس طرح جیسی تمہیں ہدایت کی ہے ۔ یقیناً اس سے پہلے تو تم لوگ گمراہ ہی تھے ۔ " (البقرہ : ۱۹۸)

آداب دعا

۵۔ پھر لوگوں کو دعا مانگنے کا سلیقہ اور اس کے آداب سکھائے۔

بہت سے لوگ اپنی دنیاوی اغراض اور ضروریات میں اتنے ڈوب جاتے ہیں کہ انھیں یہ ہوش بھی نہیں رہتا کہ اس دنیا کے علاوہ بھی کوئی دوسرا عالم ہے، جہاں انھیں مرکر جانا ہے۔ بس ان کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ بس اس دنیا ہی میں سارے ہنا ڈرے سمیٹ لو، چنانچہ ان کی ساری دعاؤں کا محور بس یہی ہوتا ہے کہ کسی طرح ان کی یہ دنیا بن جائے اور خوب بن جائے۔

اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس دنیا کو دار العذاب سمجھتے ہیں، انھیں اس سے غرض نہیں کہ ان کی دنیا کیسی گزر رہی ہے اور دنیا کے معاملات کیسے چل رہے ہیں۔ احکام الٰہی ٹوٹ رہے ہوں، خدا کی مقررہ حدیں پامال ہو رہی ہوں، خدا کے باغی دندنا رہے ہوں اور اہلِ ایمان ذلیل و خوار ہو رہے ہوں، انھیں کسی بات کی پروا نہیں ہوتی، بس وہ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کسی طور پر نجات مل جائے۔

ایسے سب لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ نہ تو یہ راستہ صحیح ہے کہ آدمی صرف دنیا ہی طلب کرتا رہے اور نہ ہی یہ راستہ صحیح ہے کہ صرف آخرت طلب کرے اور دنیا کو سرے ہی سے نظر انداز کر دے بلکہ صحیح راستہ ہے تو یہ ہے کہ:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ○ (البقرۃ: ۲۰۱)

"اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور عذابِ نار سے بچا۔"

یہ ہے زندگی کا وہ نقطۂ اعتدال جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سکھایا اور حج جیسے مبارک موقع پر جب کہ آدمی عشقِ الٰہی میں ڈوب جاتا ہے، وہاں بھی متنبہ کر دیا کہ اس معاملے میں افراط و تفریط میں مبتلا نہ ہو اور اللہ سے دنیا کی بھی بہتری طلب کرے کہ یہ آخرت طلبی کے منافی نہیں اور دنیا میں بھی اتنا نہ ڈوب جائے کہ آخرت بالکل ہی بھول جائے اور

صرف دنیا ہی دنیا رہ جائے، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی دنیا کے کام میں مصروف رہے لیکن آخرت کا کھٹکا لگا رہے،

نماز کی غلط صورتوں کی تنسیخ

۶۔ جس طرح دنیا بھر کے مشرکین نے گانے بجانے اور ناچنے تھرکنے کو عبادات کا جزو بنالیا تھا اسی طرح کفار عرب نے بیت اللہ میں نماز ادا کرنے کے لئے تسبیح و تحمید کی بجائے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کو نماز کا قائم مقام بنالیا تھا۔ اس جاہلانہ تصور کی باقیات السیئات وہ قوالیاں ہیں، جن میں موسیقی اور تالیوں کو لوگ عبادت سمجھتے ہیں۔ اس جاہلانہ تصور کی بیخ کنی کے لئے اللہ تعالیٰ نے یوں مذمت فرمائی:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً ط فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ○ (الانفال: ۳۵)

"بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے؟ بس سیٹیاں بجاتے ہیں اور تالیاں پیٹتے ہیں۔ پس اب لو، اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے اُس انکار حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔"

اور یوں ان تمام گانے بجانے والے "عبادت گزاروں" کو عذاب کی وعید سنائی۔

حج کے متعلق مختلف احکام

۱۔ منیٰ میں قیام

رمی جمار اور طواف زیارت کے بعد حج کے مناسک تقریباً ختم ہو جاتے ہیں اور زیادہ تر لوگوں کو گھروں کو واپسی کی جلدی ہوتی ہے اس لئے قیام منیٰ کے بارے میں خصوصی ہدایات دیں، ارشاد ہوا:

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۖ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ (البقرۃ : ۲۰۳)

"یہ گنتی کے چند روز ہیں، جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہئیں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں؛ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کئے ہوں ۔۔۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔"

منیٰ میں مطلوبہ قیام ۱۰ر تا ۱۳ر ذی الحج ہے لیکن اگر کوئی شخص ضرورت محسوس کرتا ہے تو اس یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ ۱۲ر ذی الحج کو واپس چلا جائے۔

لیکن یہاں پر اصل چیز جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ۳ یا ۴ دن قیام کرنے میں زیادہ فرق نہیں۔ جس چیز کی خدا کے ہاں قدر ہے وہ یہ ہے کہ آدمی نے جتنا وقت گزارا وہ کیسے گزارا۔ اگر آدمی ۴ دن رہا لیکن گھومنے پھرنے، لایعنی باتوں، شعر گوئی اور

قصیدہ خوانی میں مصروف رہا تو اس نے وقت کو ضائع کیا اور اُس نعمت سے فائدہ نہ اُٹھا سکا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عنایت کی۔ حج کا زمانہ رحمتوں کے نزول کا زمانہ ہوتا ہے۔ انسان حج کرنے جاتا ہی اس لئے ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرے اور گناہوں کی بخشش کا سامان ہو جائے۔ اب آدمی اگر اس اصل مقصد ہی سے غافل رہا تو اس کے ٹھہرنے نہ ٹھہرنے کا کیا فائدہ ہے۔

اس پاک اور مقدس مقام پر جہاں ابراہیم خلیل اللہ نے اپنے نامور فرزند اسمٰعیلؑ کو قربانی کے لئے پیش کیا، اگر ایک زائر اپنے اندر وہ جذبۂ قربانی پیدا نہ کر سکا تو وہ حج کی روح سے ناواقف رہا۔ اسے معلوم نہیں کہ آئندہ عمر میں اُسے کبھی دوبارہ اس مقام پر آنے کا موقع ملے گا بھی یا نہیں۔ اس لئے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس کے ایک ایک لمحہ کو کارآمد بنائے، خدا کی یاد سے اپنے دل کو منور کرے اور تقویٰ یعنی خدا کا خوف حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ جسے یہ دولت حاصل ہو گئی تو وہ کامیاب ہے اور اگر یہی حاصل نہ ہوا تو نری رسم ہی رسم ہے۔

۲۔ مشکلاتِ راہ اور ان کا علاج

زائرین بیت اللہ — حج اور عمرہ کرنے والوں — کے اللہ تعالیٰ نے چار ماہ حرام ٹھہرائے تاکہ وہ امن و سکون سے یہ پُر سعادت سفر مکمل کر سکیں، لیکن اس کے باوجود ایسے حالات ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی تکلیف یا بیماری کی وجہ سے اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے یا درمیان راہ میں ایسی معاند قوم و حکومت سے واسطہ پڑ سکتا ہے جو گزرنے کی اجازت نہ دے۔ کیا ان حالات میں اس کا یہ دور دراز سفر بالکل ہی اکارت جائے گا یا اس کے باوجود وہ اس ثواب سے فیض یاب ہو گا۔ جو اللہ تعالیٰ نے حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لئے لکھ رکھا ہے۔ اس کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰی یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًی مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ

اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (البقرہ: ۱۹۶)

"اللہ کی خوشنودی کے لئے جب حج اور عمرے کی نیت کرو، تو اُسے پورا کرو، اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے، اللہ کی جناب میں پیش کرو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوالے، تو اسے چاہیئے کہ فدیہ کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔ پھر اگر تمہیں امن نصیب ہو جائے (اور تم حج سے پہلے مکے پہنچ جاؤ) تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے، وہ حسبِ مقدور قربانی دے اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر، اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت اُن لوگوں کے لئے ہے، جن کے گھر بار مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں، اللہ کے اِن احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

صاحبِ استطاعت پر حج کی فرضیت

اللہ نے ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر حج فرض کیا ہے۔ استطاعت کا مطلب یہ ہے کہ سفرِ حج کا راستہ کا خرچ حج کرنے والے کے پاس ہو۔ دورانِ حج جو قیام ہو اس کے اخراجات کی رقم اس کے پاس ہو اور اپنے اہل وعیال کے پاس اتنی رقم چھوڑ جائے کہ سفرِ حج سے واپسی تک ان کو کفایت کرے اور فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہوں۔

نیت کی درستگی

ایسا صاحبِ استطاعت شخص جب حج یا عمرے کا ارادہ کرے تو سب سے پہلے

اپنی نیت کو درست کرے کیونکہ:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (مسلم)

"تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔"

نیت کی درستی یہ ہے کہ حج یا عمرہ خالص خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔ اس سے مقصود نہ تو نمود و نمائش ہو کہ لوگ اسے "حاجی" کہیں اور لوگوں میں اس کے حج و عمرے کے چرچے ہوں، نہ اُس سے سیر و تفریح مقصود ہو، بلکہ خدا کے گھر میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں کی بخشش کی التجا کرنا ہو اور نہ اس سے مقصود تجارت و کاروبار ہو، گو دوران حج تجارت کی اجازت ہے۔ مگر یہ ایک رعایت و رخصت ہے۔ کہ زائر طویل عرصے کے سفر اور قیام کی وجہ سے مالی مشکلات میں مبتلا نہ ہو۔ اس رعایت و رخصت کو مقصود بنا لینا دراصل مقصد حج کو پس پشت ڈال لینا ہے اور ان فوائد سے محروم رہنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حج و عمرے کے اندر رکھے ہیں۔

اب اگر کسی شخص نے حج یا عمرے کی نیت کر لی اور گھر سے نکلا کہ اچانک اسے کچھ ایسے حالات پیش آ گئے جن کی بنا پر وہ اپنے سفر کو جاری نہیں رکھ سکتا تو اسے کیا کرنا چاہیئے، اس کے بارے میں یہاں ہدایات دی گئی ہیں۔

روکاٹیں

سفرِ حج و عمرہ سے رک جانے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں:

- ایک یہ کہ راستہ میں شدید بدامنی ہو، لٹنے، ہلاک ہونے یا قید ہو جانے کا اندیشہ ہو۔
- دوسرے یہ کہ اچانک جنگ بھڑک اٹھنے کی وجہ سے راستے مسدود ہو گئے ہوں۔
- تیسرے یہ کہ زائر خود کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا ہو کہ جس کی وجہ اس کا سفر جاری رکھنا ممکن نہ ہو یا مرض میں اضافہ کا اندیشہ ہو۔

ان موانع کی بنا پر حج یا عمرہ ادا کرنے سے اگر کوئی زائر بیت اللہ رک جائے تو اس رک جانے کو اصطلاحاً احصار کہتے ہیں اور رکنے والے شخص کو مُحصَر کہتے ہیں۔

احصار کی صورت میں محصر نے اگر صرف عمرہ یا حج افراد کی نیت کی ہو تو صرف ایک قربانی کا جانور

حرم بھیج دے یا ایک جانور کی رقم بھیج دے تاکہ اس کی جانب سے وہاں قربانی کی جا سکے۔ اگر اس نے حج قران (جس میں عمرہ اور حج کا ایک ہی احرام باندھا گیا ہو) کی نیت کی ہو یا حج تمتع (جس میں عمرہ کا احرام علیحدہ باندھا اور اس کے بعد حج کا احرام علیحدہ باندھا ہو) کی نیت کی ہو تو دو قربانیوں کے جانور حرم بھیجے یا دو جانوروں کی قیمت حرم بھیج دے تاکہ وہاں اس کی جانب سے قربانی دی جا سکے۔

محصر اس وقت تک احرام نہ کھولے گا جس وقت تک قربانی نہ ہو جائے۔ دور دراز علاقوں میں گھر جانے والے کے مناسب ہے کہ وہ قربانی کی تاریخ مقرر کر دے، تاکہ وہ مقررہ تاریخ پر احرام کھول سکے۔ ایسے آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ قربانی کے دن ہی اسے اطلاع مل جائے، اس لئے مقررہ تاریخ ہی قربانی کی تاریخ تصور کی جائے گی۔

اگر اس دوران ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ محصر قربانی سے پہلے پہنچ کر حج میں شریک ہو سکتا ہے، تو اس کے لئے واجب ہے کہ وہ حج کے لئے روانہ ہو جائے اور حج میں شریک ہو۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو روانہ ہونا واجب نہیں۔

قربانی کے بعد احرام اتارا جائے

مُحرم کے لئے ضروری ہے کہ قربانی کرنے کے بعد سر منڈوائے یا بال کٹوا دے، پھر احرام اتارے۔ بعض اوقات سر میں کسی مرض یا تکلیف یا چوٹ کی وجہ سے اچانک ضرورت پیش آجاتی ہے کہ قربانی سے پہلے ہی سر منڈوا دیا جائے تو ایسی صورت میں اس کو ایک قربانی دینا ہوگی اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو ۳ روزے یوم النحر (۱۰ ذی الحج) سے پہلے اور سات روزے ایام تشریق (۱۳ ذی الحج تک) کے بعد گھر پہنچ کر رکھے۔ لیکن یہ رعایت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو حدود میقات سے باہر رہتے ہیں۔

یہ ہدایات دینے کے بعد فرمایا کہ "اللہ کے ان احکام خلاف ورزی بچو اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے جو بھی احکام دیئے ہیں اس لئے دیئے ہیں کہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔ انسانی ضرورتوں اور مجبوریوں کی بنا پر کچھ تخفیف بھی دی

دی گئی ہیں ان کو معمول نہ بنا لیا جائے اور اللہ کے قوانین کو موم کی ناک نہ بنا لیا جائے کہ جب چاہا، جدھر چاہا موڑ لیا۔ شریعت الٰہی سے جو کوئی بھی کھیلے گا وہ اللہ کی سزا سے نہ بچ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ جہاں اپنے بندوں کے لئے بے انتہا شفیق و کریم ہے، وہیں اپنے نافرمان و سرکش بندوں کو خاص حد تک ڈھیل دینے کے بعد سزا بھی سخت دیتا ہے، تاکہ دوسرے نافرمانوں کو نصیحت و عبرت ہو، اور وہ خدا کے احکام کے خلاف دلیر ہونے سے باز آجائیں، نیز جو کمزور لوگ ہیں وہ سرکشوں کی شرارتیں دیکھ دیکھ کر اطاعتِ الٰہی کی راہ سے پھسل نہ جائیں۔

۳۔ شعائر اللہ کی تعظیم

شعائر سے مراد وہ نشانیاں اور علامات ہیں جنھیں اللہ نے بطور مظاہر دین مقرر کیا ہے، جو حقائق دین کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور امت مسلمہ کے لئے ایک امتیازی وصف کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں دور سے دیکھ کر ایک آدمی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان شعائر کا حامل امت مسلمہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی عزت و تکریم کرنا علامت تقویٰ ہے۔ ان کو جاری و ساری رکھنا شریعت الٰہی میں مطلوب ہے۔

دراصل ہر مذہب اور مسلک اپنے اپنے شعائر رکھتا ہے، مثلاً کمیونسٹوں کے شعائر سرخ رنگ، ہتھوڑا اور درانتی ہیں۔ چوٹی، زنار اور مندر ہندوؤں کے شعائر میں سے ہے۔ کڑا، کرپان اور کیس سکھوں کے شعائر ہیں۔ صلیب، گرجا اور قربان گاہ عیسائیوں کے شعائر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سب گروہوں سے ممیز کرنے کے لئے ان کے واسطے بھی شعائر مقرر کئے اور ان کو شعائر اللہ قرار دیا، تاکہ ایک طرف مسلمان ان کی پابندی کرتے ہوئے فخر کریں کہ اللہ کے مقرر کردہ شعائر کی پابندی کر رہے ہیں۔ تو دوسری طرف ان کا تقدس بھی نمایاں ہو اور کوئی مسلمان ان کو چھوڑتے ہوئے بھی سو مرتبہ سوچے کہ وہ کس چیز کو چھوڑ رہا ہے۔ مسجد، تکبیر، نماز، داہنے ہاتھ سے کام کرنا، قربانی، مناسک حج وغیرہ سب شعائر اللہ ہیں۔

شعائر اللہ کے بارے میں جامع ہدایت

اس ہی سلسلے میں شعائر اللہ، نیکی و تقویٰ کے بارے میں ابتدا ہی میں ایک جامع ہدایت دیتے ہوئے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (المائدہ ۵: ۲)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو ــــــ نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کر لو، نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ اُن جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں، نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے ربّ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں۔ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو ــــــ اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی اُن کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں! جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں اُن میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اس کی سزا بہت سخت ہے۔"

یہاں سب سے پہلے یہ کہہ کر کہ "اے ایمان والو! شعائر اللہ کو حلال نہ کر لو" مسلمانوں کو متنبّہ کر دیا۔ کہ شعائر اللہ اس لئے مقرر نہیں کئے جاتے کہ ان کی بے حرمتی کی جائے اور ان کو پامال کیا جائے بلکہ اس سے مقرر کئے جاتے ہیں کہ ان کا دل سے احترام کیا جائے اور ان کی پابندی کی جائے۔ اور اس زوردار تمہید سے ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ ان کی ہر حال میں پابندی کرنا ہے، ان کو توڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ جرم ہے کہ جس کا ایک صاحبِ ایمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ایمان کا تو بنیادی تقاضا یہ ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ اب اگر کوئی شخص اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دے لیتا ہے یا حرام کی ہوئی چیز کو اپنے لئے حلال کر لیتا ہے تو چاہے وہ زبان سے اس کا اعلان نہ کرے، لیکن عملاً وہ ثابت کرتا ہے کہ اسے بھی حلال و حرام کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ اب اس کے بعد ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ ایسے شخص کے پاس "ایمان" نام کی کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے؟ ایک مومن کا تو کام ہی یہ ہے کہ اُس اللہ کے احکام کی جس پر وہ ایمان رکھتا ہے، بے چون و چرا اطاعت کرے اور اپنی بساط بھر ان کی تعمیل کرے، اور ان کی خلاف ورزی کرنے کا دل میں خیال تک نہ لائے۔ جب تک یہ بات دل و دماغ میں راسخ نہ ہو جائے خدائی احکام پر عمل کرنا اور ان پر قائم رہنا ممکن نہیں۔

اس بنیادی بات کو بتانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان شعائر کی تفصیلات بیان کیں جو حج سے تعلق رکھتے ہیں۔ فرمایا:

١۔ "نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کر لو یعنی رجب، ذی القعدہ، ذی الحج اور محرم کے چار مہینوں کو جو زائرین کعبہ کے سفر کے لئے مخصوص ہیں، بالکل پرامن رہنا چاہئے۔ نہ ان میں جنگ کی جائے اور نہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے ان مہینوں میں امن میں کسی طرح کی خرابی واقع ہو۔ جو شخص بھی حج یا عمرہ کے لئے جانا چاہیے وہ بلا روک ٹوک اور بغیر کسی خطر کے جائے اور تمام راستے محفوظ و مامون ہوں۔ اس ہدایت کی اہمیت و معنویت پوری طرح اس ہی وقت ظاہر ہوتی ہے جب ان حالات کو بھی سامنے رکھا جائے جن میں یہ حکم دیا گیا تھا۔

کفار قریش، جن کو خانہ کعبہ کی تولیت حاصل تھی، مسلمانوں سے ١٩ سال سے برسرِ پیکار تھے۔ مدینہ طیبہ کو مسلمانوں کی ہجرت کو ٦ سال گزر گئے تھے لیکن کفار نے اپنی تولیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں پر حج و عمرہ کے لئے دروازے بند کر رکھے تھے۔ باوجود اس بات کے کہ کفار قریش خانہ کعبہ کی حرمت، زائرین حرم کی حرمت اور حج و عمرہ کے مہینوں کی حرمت کے پوری طرح قائل تھے، لیکن مسلمانوں سے دشمنی اور عداوت نے انھیں اتنا اندھا بہرا کر دیا تھا کہ وہ اپنے ان تمام مسلمہ عقاید و روایات کے خلاف جو تقریباً ڈھائی ہزار سال سے ان کے معاشرہ میں رچی بسی ہوئی تھیں، مسلمانوں کو کسی قسم کی رعایت دینا تو درکنار، حج و عمرہ کا

حق بھی دینے کے روادار نہ تھے۔ اور ہر طرح سے ان کا راستہ روکنے کے لئے تیار رہتے تھے؛ چنانچہ جب ۶ھ کے آخر یا ۷ھ کی ابتداء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تو قریش نے مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا اور مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پہلے ہی قدم پر روک دیا اور انھیں بتایا کہ تمہارا کام حدود اللہ کو پامال کرنا نہیں بلکہ ان کو قائم کرنا ہے، خدا کے نافرمانوں نے احکام الٰہی کو جس طرح بازیچۂ اطفال بنا لیا ہے، اُس سے دنیا کو روک کر پھر سے ان کی عظمت قائم کرنا ہے۔

اس نازک موقع پر مسلمانوں کی حالت اس حالت سے قطعی مختلف تھی جو ۶ سال پہلے تھی۔ ۶ سال قبل وہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں اپنے گھروں سے نکلے تھے، لیکن اللہ کے فضل اور مسلمانوں کی جانثاریوں کی وجہ سے ۶ سال کے قلیل عرصہ میں اب مسلمان اس پوزیشن میں تھے کہ وہ قریش کے تمام راستوں پر قابض تھے اور جب چاہتے ان کی تجارت اور حج اور عمرہ کی آمد روک سکتے تھے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں یہ صرف احکام ربانی کا معجزہ تھا کہ مسلمانوں کے اٹھتے ہوئے ہاتھ رک گئے اور خدا کی قائم کی ہوئی حرمتیں پھر سے پوری شان سے قائم ہو گئیں۔

۲۔ "نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ ان جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوں۔"

یہ حکم پہلے حکم کا تتمہ اور منطقی نتیجہ ہے۔ جب زائرین حرم کو نہیں روکا جا سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے قربانی کے جانور جو خدا کے نام پر قربان کئے جاتے ہیں، کیسے روکے جا سکتے تھے۔ اس لئے ایسے تمام جانوروں سے تعرض کرنے سے روک دیا جو اللہ کے لئے مخصوص کر کے قربانی کے لئے بھیجے جا رہے تھے۔

۳۔ "نہ اُن لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں۔"

یہ اوپر دیئے ہوئے مجمل حکم کی تفصیل و تشریح بھی ہے اور عقلی و جذباتی دلیل بھی۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہارا کام اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اب

اگر یہی کام کچھ دوسرے لوگ کرنا چاہتے ہیں تو تمہیں توان کی ہر طرح معاونت کرنا چاہیئے نہ کہ روکنا۔ اپنی اس حیثیت کو ہر وقت سامنے رکھو اور نیکی پر چلنے میں ہر شخص کی، تواہ وہ دوست ہو یا دشمن ہر طرح سے مدد کرو کہ یہی تمہارے شایان شان ہے۔

۴۔ اس کے بعد اس ہی سے ملتے جلتے ایک اور حکم کی طرف توجہ دلائی، فرمایا:

"ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم شکار کر سکتے ہو۔"

پہلے مخاصمت کے طور پر جانوروں پر ہاتھ ڈالنے سے روکا، اب رضا کارانہ طور پر تمام جانوروں پر ہاتھ ڈالنے سے روک دیا اور حالت احرام میں شکار کرنے کی ممانعت کردی، تاکہ اللہ کی تمام مخلوق کے لیئے تمام راستے مامون و مصئون ہو جائیں۔

۵۔ اس کے بعد ایک آخری ہدایت دینے کے بعد اس حکم کی تکمیل کردی اور دین کی روح اور اس کی بنیاد کو واضح کر دیا، فرمایا:

"اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں، جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں اُن میں سب سے تعاون کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔"

یہ ہے وہ اصل بنیاد جس پر مسلمانوں کو اپنے تمام کاموں کو استوار کرنا چاہیئے۔ مسلمان کی حیثیت کیا ہے؟ یہی کہ وہ اللہ کا سپاہی ہے، نیکی کا پیامبر ہے، بدی کو مٹانے والا ہے۔ اپنے جذبات و خیالات کو، اپنے اعمال و افکار کو خدائی احکام کے سانچے میں ڈھالنے والا ہے۔ حالات چاہے کتنے ہی سنگین اور اشتعال انگیز کیوں نہ ہوں، اس کو بہر حال احکام خداوندی ہی کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اگر باہر کے دشمن کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں تو ان کی راہ میں اس لئے رکاوٹیں نہیں ڈالنا ہے کہ یہ کام دشمن کر رہا ہے، بلکہ جس حد تک ممکن ہو اس نیکی میں اس سے تعاون کرنا ہے کہ اگر اُسے آج ایک جزوی نیکی کی توفیق ہوئی ہے تو کل شاید وہ پوری نیکی اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اسی طرح اگر کوئی اپنا آدمی غلط کام کرتا ہے تو اس سے صرف نظر نہیں کرنا ہے۔ بلکہ اسے روکنا ہے کہ کہیں یہ غلط روش اس کی عادت نہ بن جائے اور

چھوٹی چھوٹی ہدایتوں کی خلاف ورزی کرتے کرتے بڑے بڑے احکام کو توڑنے نہ لگ جائے۔

اور یہ سارے کام خدا کے خوف سے انجام دینا چاہیئے نہ کہ اپنے ذاتی یا جماعتی مصلحتوں کے تحت ۔ اور ہر وقت یہ حقیقت ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ خدا کے احکام کی جو کوئی بھی خلاف ورزی کرے گا، وہ اللہ کی سزا سے نہ بچ سکے گا۔

پھر ان شعائر میں سے چند شعائر کے متعلق جو حج سے تعلق رکھتے ہیں تفصیلات بیان فرمادیں ۔

صفا و مروہ ۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ : ۱۵۸)

"یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرے اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا، اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے ۔"

صفا اور مروہ بیت اللہ کے قریب وہ دو پہاڑیاں ہیں جہاں حضرت ہاجرہ اپنے شیر خوار بچے اسمٰعیل ؑ کے لئے پانی کی تلاش میں بار بار دوڑی تھیں ۔ اس سعی و جہد کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرماتے ہوئے بطور انعام زمزم عطا فرمایا تھا ۔

حضرت ابراہیم ؑ نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنی محبوب بیوی حضرت ہاجرہ اور اکلوتے شیر خوار بیٹے اسمٰعیل ؑ کو ایک بے آب و گیاہ غیر آباد چٹیل پتھریلے میدان میں تنہا چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے لیئے جس تسلیم و رضا کا شاندار مظاہرہ کیا تھا اور توکل علی اللہ کی جو بے مثال نظیر قائم کی تھی، وہ تاریخ انسانی میں قربانی کا ایک درخشاں ترین نمونہ ہے ۔ پھر حضرت ہاجرہ نے اللہ تعالیٰ کا حکم سن کر جس صبر و شکر کا مظاہرہ کیا وہ قیامت تک اہل عزیمت کو ایک تازہ ولولہ عطا کرتا رہے گا ۔ قربانی، توکل، صبر و شکر، تسلیم و رضا کے اس عظیم مظاہرے کو اوراقِ تاریخ

میں دوامِ عطا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پہاڑیوں ـــــ صفا و مروہ ـــــ کو شعائر اللہ قرار دیا اور حضرت ہاجرہ کی ادائے سعی و جہد کو حج و عمرہ کا حصہ قرار دے کر ہمیشہ کے لئے محفوظ فرما دیا۔ اور یہ فرما کر کہ "اِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ ○

"اللہ تعالیٰ قدردان اور صاحبِ علم ہے۔"

اس کی قدردانی پر مہرِ ثبت فرما دی۔

قربانی کا جانور

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قربانی کے ان جانوروں کو شعائر اللہ قرار دیا جو حج کے موقع پر قربانی کے لئے بھیجے جاتے ہیں، فرمایا:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰھَا لَکُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ لَکُمْ فِیْھَا خَیْرٌ

"اور اونٹوں (قربانی کے) ہیں، جنھیں ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ بنایا ہے ان میں تمہارے لئے بھلائی ہے۔"

یہاں صرف یہی نہیں بتایا کہ قربانی کے جانور شعائر اللہ ہیں بلکہ یہ بھی بتایا کہ ان میں تمہارے لئے بھلائی ہے اور آگے اس بھلائی کی طرف اشارہ بھی کر دیا فرمایا۔

فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْھَا صَوَآفَّ ج فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُھَا فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ط کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰھَا لَکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ (الحج: ۳۶)

"پس انھیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو، اور جب قربانی کے بعد ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کئے بیٹھے ہیں، اور اُن کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے تمہارے لئے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو۔"

یعنی ان جانوروں کو تمہارے لئے محض مقدس نہیں بنا دیا بلکہ قربانی کے بعد اُن کا کھانا اور ان کا تقسیم کرنا، اپنی ضرورت اور دوسروں کی ضرورت پوری کرنا تمہارے لئے حلال کر دیا۔ اس حکم کے فوائد کا اندازہ اُس ہی وقت لگایا جا سکتا ہے جب ہم اپنے سامنے وہ مقام رکھیں

جہاں یہ حکم دیا گیا تھا۔ ایک ایسے موقع پر جہاں خلقِ خدا کا عظیم اژدحام ہو، کھانے پینے کی اشیاء محدود ہوں، وہاں قربانی کے گوشت کو حلال قرار دینا ایک ایسی نعمت ہے جس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ ایک غیر آباد اور سنسان جگہ میں گوشت کی یہ فراوانی، اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور اس کی رحمت و رافت کی ایسی کھلی کھلی نشانی ہے جس سے ہر چشمِ بینا بندۂ رحمتِ ربّانی سے فیض یاب ہو سکتی ہے اور ہر قلبِ بیدار شکر و سپاس سے لبریز ہو سکتا ہے۔

تمام مراسمِ حج

اس سے پہلے اُن تمام مراسمِ حج کو شعائرُ اللہ قرار دیا جو دورانِ حج انجام دیئے جاتے ہیں، ارشاد ہوا:

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ○ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ○ ذَٰلِكَ ۖ وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ ۗ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ۖ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ○ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ○ ذَٰلِكَ ۖ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ ○ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ○ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ

(الحج: ۲۸-۳۴)

"تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لئے رکھے گئے ہیں اور چند مقررہ دنوں میں، اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے انھیں بخشے ہیں، خود بھی کھائیں

اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں، پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں
پوری کریں، اور اُس قدیم گھر کا طواف کریں۔
یہ تھا (تعمیرِ کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے
تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لئے بہتر ہے۔
اور تمہارے لئے مویشی جانور حلال کئے گئے، ماسوا اُن چیزوں کے جو تمہیں
بتائی جا چکی ہیں۔ پس بتوں کی گندگی سے بچو، جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو، یکسو
اللہ کے بندے بنو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک
کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے اُچک لے جائیں
گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اُس کے چیتھڑے اُڑ
جائیں گے۔"
یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو)، اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام
کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔
تمہیں ایک وقت مقرر تک اُن (ہدی کے جانوروں) سے فائدہ اٹھانے کا
حق ہے، پھر اُن (کے قربان کرنے) کی جگہ اُسی قدیم گھر کے پاس ہے۔
ہدایت کے لئے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کیا ہے، تاکہ (اُس امت)
کے لوگ اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے ان کو بخشے ہیں۔"

حج کی حقیقت و اہمیت

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حج کا مقصد بتایا، اُس کے متعلق چند احکام بتائے، شعائر
اللہ کی نشاندہی کی اور ان کی اہمیت و وسعت بتائی۔

پہلی بات یہ فرمائی "تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لئے رکھے گئے ہیں۔"

حج ایک ایسی عبادت ہے جو اسلام میں شاید سب سے زیادہ پُرمشقت عبادت ہے
اور شروع سے لے کر آخر تک قربانیوں سے لبریز ہے۔ اس میں وقت کی قربانی ہے، مال کی
قربانی ہے، جانوروں کی قربانی ہے، جسمانی قوتوں کی قربانی ہے۔ صبح کہیں ہے، دوپہر

کہیں ہے، شام کہیں ہے، رات کہیں ہے اور پھر اگلی صبح کوئی دوسری جگہ ہے۔ وقت محدود اور اللہ کی رحمتیں سمیٹنے کے مواقع غیر محدود۔ ہر مقام اپنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بیت اللہ کا طواف، منیٰ کا قیام، میدانِ عرفات میں دعائیں اور مناجاتیں، مزدلفہ میں نالۂ نیم شبی، منیٰ میں قربانی اور پھر رمی جمار، غرض جہاں جاؤ ایک نئی شکل اور ایک نیا کیف۔ پھر اس تگ۔۔۔ ودَو اور جدوجہد میں جو محویت ہوتی ہے، جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، اللہ کی اطاعت کا جو شوق ابھرتا ہے اس کو نہ کوئی قلم بیان کر سکتا ہے اور نہ کوئی زبان۔ یہ تو وہ کیف ہے جو وہاں جا کر ہی حاصل ہوتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ ؏۔

ہے دیکھنے کی چیز، اسے بار بار دیکھ

سچ یہ ہے کہ حج ہی ایک ایسی عبادت ہے کہ جس سے کبھی سیری نہیں ہوتی اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف آتا ہے اور ایک نیا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو حج کی سعادت میسر نہ آئی وہ تو سمجھیں گے کہ چند مقامات کی زیارت ہے اور ایک طویل سفر کی مشقت۔ وہ کیا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں کیا دولت لٹ رہی ہے اور کس فیض کی بخشش عام ہو رہی ہے۔ اس ہی لئے تو اللہ نے فرمایا:

لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ

"ان فائدوں کا مشاہدہ کریں جو ان کے لئے اس میں رکھ دیئے گئے ہیں۔"

حج کو تصویروں، بیانوں، تقریروں سے سمجھنا ناممکن ہے۔ یہ تو جسم و روح کا سودا ہے، جب تک دونوں حاضر نہ ہوں، کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر بتایا کہ عرفات سے منیٰ واپس آکر (۱۰ ذی الحج کو) قربانی دیں، نہا دھو کر اپنی جسمانی آلائشیں دور کریں، دو دن جو گرد و غبار میں اٹ گئے تھے ان سے چھٹکارا پائیں اور لباس بدل کر رمی کریں اور اپنے جذبۂ جہاد کو پھر تازہ کریں اور اس سے فارغ ہو کر پھر طواف بیت اللہ کریں اور اپنے مرکز ایمان سے وابستگی سے پھر اپنے دل کو معمور کر لیں۔ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ نے جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان کی پابندی کرتے ہوئے اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کا عادی بنا لیں۔ اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کی اس ہی عادت کو راسخ

کرنا تعمیر کعبہ کا مقصد قرار دیا۔

اس کے بعد اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت " توحید باری تعالیٰ " کی طرف توجہ دلائی گئی کہ اس کو پالینا اور اختیار کرلینا ہی انسانیت کی سب سے بڑی معراج ہے جس نے توحید کو سمجھ لیا اور اس پر جم گیا، اس نے گویا آسمانی حقیقت کو پالیا۔ اس کے برعکس جو شرک کی گندگیوں میں پھنس گیا وہ ہلاکت و تباہی کے ایسے مہیب غار میں گر گیا جہاں سے سلامت نکلنا ممکن نہیں۔ حج کرنے کے بعد بھی اگر انسان نسل و رنگ کی محبت، ملک و قوم کی عصبیت، رسم و رواج کے بندھن، غیر اللہ کی اطاعت و خوشنودی، کبر و انانیت اور غیظ و غضب کی آلودگیوں سے دامن نہ چھڑا سکا تو اسے کیا ملا؟ ان ہی کو تو دھونے کے لئے اللہ نے اُسے اپنے گھر میں بلایا۔ اب اگر وہاں جا کر بھی وہ ان سب گندگیوں سے چمٹا رہا تو پھر اس محنت، اس قربانی، اس مال کے صرف کا کیا مصرف؟

ہاں، ان سب آلائشوں سے صرف وہ نجات حاصل کر سکتا ہے جو اللہ کے شعائر کا احترام کرے اور اس کے احکام کی پابندی کرے اور یہ دولت انھیں ہی نصیب ہوتی ہے جن کے دل تقویٰ سے لبریز ہوں، خدا کا خوف دل میں سمایا ہوا اور اس کی اطاعت کا جذبہ امڈ رہا ہو۔

۴۔ دوران حج شکار کی ممانعت

حج کے دوران زائر حرم کو قطعی طور پر غیر ضرر رساں بنانے اور ہر شے کے لئے حتیٰ کہ جانور، گھاس پھونس، درخت، وغیرہ تک کے لئے امن و سلامتی کا پیامبر بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف پابندیاں عائد کیں ارشاد ہوا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ط اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ط اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝ (المائدہ ۵:۱)

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بندشوں کی پوری پابندی کرو۔ تمہارے لئے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کئے گئے، سوائے ان کے جو آگے

چل کر تم کو بتائے جائیں گے۔ لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لئے حلال نہ کرلو۔ بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔"

جس طرح روزے میں آدمی بہت سی حلال چیزوں سے ایک خاص وقت تک کے لئے محروم ہو جاتا ہے اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے حالت احرام میں بہت سی حلال اور جائز باتوں سے روک دیا تاکہ انسان کی تمام خواہشات و عادات بالکلیہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہو جائیں۔ پودوں، درختوں کو کاٹنا، لوگوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا، دھکا دینا، غصہ کا اظہار کرنا، اِن سب کو ممنوع قرار دیا۔ ایک خاص مدت تک لباس تبدیل نہ کرنا، خوشبو استعمال نہ کرنا نگاہوں کو اور اعضا کو پابند رکھنا، یہ سب پابندیاں اس لئے لگائی گئیں کہ جسم کا رواں رواں اللہ کے سامنے انقیاد و سمع وطاعت کا پیکر بن جائے۔

اب اس کے بعد ایک اور نئی پابندی لگائی گئی تاکہ زندگی کا کوئی گوشہ اس سمع وطاعت سے خالی نہ رہے۔

جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے رزق کا ذریعہ بنایا۔ ان کا کھانا اس کی زندگی کا سبب بنایا اور اس کے لئے حلال وطیب قرار دیا، لیکن ان ہی حلال وطیب جانوروں کو حالتِ احرام میں شکار کرنا حرام قرار دیا تھا، تاکہ ایک حاجی سے نہ صرف انسان ہی مامون ومصؤن رہیں بلکہ جانور تک بھی اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔

اس ممانعت کا مقصد اور اس کی حکمت اور اس کی تفصیلات آگے بیان کی ہیں، لیکن یہاں پر غیر مشروط اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے فرمایا:

"بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔"

بندۂ مومن کا یہ کام ہے ہی نہیں کہ وہ یہ پوچھے کہ یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے، اس کی غایت کیا ہے اور اس کی مصلحت کیا ہے؟ اُسے جب یہ معلوم ہو جائے کہ کس کام کا حکم اللہ نے یا اس کے رسول نے دیا ہے تو بس اس کو ایک ہی رویہ زیب دیتا ہے کہ

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (البقرۃ: ۲۸۵) "ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔"

اور وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيمًا (النساء: ۶۵) "اور وہ پوری طرح سے سرِ تسلیم خم کردیں۔"

ابراہیم علیہ السلام نے، جن کی پیروی اور قربانیوں کے طفیل میں یہ حج کی نعمت ملی ہے، اپنی پوری زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ مومن کی زندگی سر تا پا تسلیم و رضا ہے۔ اب جو لوگ ان کی پیروی کا دم بھرتے ہیں ان کے لئے بھی صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ بھی اسی روش کو اپنائیں جو طریقۂ ابراہیمی سے مطابقت رکھتی ہو۔

شکار کے بارے میں مزید ہدایات دیتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ ۗ عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ ۚ وَمَنْ عَادَ فَيَنتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ○ (المائدہ: ۹۴-۹۵)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ تمہیں اُس شکار کے ذریعہ سے سخت آزمائش میں ڈالے گا۔ جو بالکل تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہو گا، یہ دیکھنے کے لئے کہ تم میں کون اُس سے غائبانہ ڈرتا ہے، پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اُس کے لئے دردناک سزا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، احرام کی حالت میں شکار نہ مارو، اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اُس نے مارا ہو، اُس کے ہم پلّہ ایک جانور اُسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہو گا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا یا نہیں، تو اس گناہ کے کفارہ میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہو گا، یا اُس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے۔ تاکہ وہ اپنے کئے کا مزہ چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اللہ نے معاف کر دیا، لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا، اللہ سب

پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔"

ان آیات کا شدید تنبیہی انداز بتا رہا ہے کہ اس معاملہ کی اللہ تعالیٰ کی نظر میں کیا اہمیّت ہے اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نظم و ضبط کے کسی اعلیٰ معیار پر دیکھنا چاہتا ہے۔

اطاعتِ مطلوبہ کا معیار

اطاعت کا ایک درجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو کسی حکم کی خلاف ورزی کا موقع ہی نہ ملا اور وہ کامل سلامتی کے ساتھ اپنے ایمان کو بچا لے گیا اور آزمائش سے بچ گیا۔ یہ دراصل اللہ کا انعام ہے اور ایمان کا ابتدائی درجہ ہے۔

اطاعت کا اگلا درجہ یہ ہے کہ احکام کی خلاف ورزی کے بھرپور مواقع سامنے موجود ہے اور بجز اللہ کے خوف کے، آدمی کو دونوں ہاتھ رنگنے سے کوئی چیز روکنے والی نہیں۔ ایسی زبردست ترغیب و تحریص کی موجودگی میں اگر کسی شخص نے اپنے نفس کو روکے رکھا اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی سے باز رہا تو اُس نے اپنے اخلاص کا پورا پورا ثبوت دے دیا۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے یہ بشارت ہے کہ:-

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ (النّٰزِعٰت: ۴۱)

"اور جو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے باز رکھا اس کا آخری ٹھکانا جنت ہے۔"

یہی وہ ایمان کا اعلیٰ مقام ہے جس پر اللہ تعالیٰ ہر بندۂ مومن کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس ہی مقام کی اہمیّت و فضیلت بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے واقعات اتنی تفصیل سے بیان کئے تاکہ تعمیل حکم کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے اور ایسے تمام مواقع پر جہاں قدم ڈگمگاتے ہیں یا پاؤں پھسلتے ہیں، اسوۂ ابراہیمی سامنے رہے اور بندۂ مومن جادہ استقامت سے نہ ہٹ سکے۔

اس کے مقابل میں جس شخص کی ہر تحریص و ترغیب کے موقع پر رال ٹپک پڑتی ہے اور منہ میں پانی بھر آتا ہے، وہ اس راہ کا راہی ہے ہی نہیں۔ ایسے لالچی اور کمزور طبیعتوں کے

لوگوں کو ان الفاظ میں شدید وعید سنائی گئی :

"پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اُس کے لئے دردناک سزا ہے ۔"

اور پھر ان تمام لوگوں کو جو خدائی احکام کو جان بوجھ کر توڑتے ہیں، بڑے واضح اور دوٹوک انداز میں بتایا کہ :

"پہلے جو کچھ ہو چکا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے ۔"

نظم وضبط کے اس معیارِ مطلوب کی تربیت دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حج کا مبارک سفر منتخب فرمایا۔ اس سفر میں ہر حج کرنے والا گھر ہی سے اللہ تعالیٰ کے عشق میں سرشار ہو کر روانہ ہوتا ہے۔ راستہ بھر تلبیہ کرتے ہوئے اپنے عزمِ اطاعت وقربانی کا بار بار اعادہ کرتا ہے اور اس کو مضبوط کرتا ہے۔ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کا پاس کرتے ہوئے احتیاط سے راستہ طے کرتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو تقوٰی سے مزین کرتا ہے۔ ایسی پاکیزہ فضا میں اس کی مزید تربیت کے لئے اُسے بتایا جا رہا ہے کہ حالت احرام میں شکار ممنوع ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ شکار کی طرف اشارہ بھی کرنا منع ہے۔ ذرا خیال کیجیے کہ کھلا میدان ہو، کام کاج سے بے فکری ہو، وافر فارغ اوقات ہوں، اور پھر دائیں بائیں سے مرغوب شکار کے جانور، پرندے وغیرہ دوڑ دوڑ کر نکل رہے ہوں، ایسے میں کون ہے جس کے دل میں اکساہٹ پیدا نہ ہو گی، لیکن تربیت بھی تو یہی دینا ہے کہ جب دنیا کے فوائد ومنافع تمہاری طرف باہیں کھولے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں تو تم اپنے آپ کو قابو میں رکھو اور کسی چوکیدار، پہرہ دار یا نگراں کے بغیر محض نظروں سے اوجھل مگر دل سے قریب خدا کے خوف پیشِ نظر اپنے دل ونگاہ پر، ہاتھ پاؤں پر، اعضاء وجوارح پر مکمل قابو رکھو اور خدا کے حکم سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہ ہٹنے دو۔ جس نے ایسے طمع ولالچ کے موقع پر اپنے آپ کو بچا لیا اُس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آئندہ زندگی کے ایسے ہی نازک مواقع پر ثابت قدم رہ سکے گا ۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ساری پابندیاں آزمائشیں انسان کو سنوارنے اور بنانے کے لئے ہیں، اس کو ہلاک و تباہ کرنے کے لئے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی پر اتنا بوجھ نہیں ڈالتا کہ وہ اس کو برداشت نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام تو انسانیت کو جمال بخشنے اور مہذب بنانے کے لئے آئے ہیں، اس کو اجاڑنے اور برباد کرنے کے لئے نہیں۔ چنانچہ جہاں انسان کو حقیقی ضرورت لاحق ہوتی ہے اس کی پوری پوری رعایت کی گئی ہے اور یہی اسلام کا کمال ہے۔

بحری شکار کی اجازت

خشکی میں جہاں انسان کو متبادل روزی اور رزق کے ذرائع حاصل ہو سکتے ہیں، وہاں ایک محبوب مشغلے سے روک دیا اور اس کی تربیت کا سامان کیا، لیکن بحری سفر میں جہاں زادِ راہ ختم ہونے کے بعد سوائے ہلاکت کے کوئی راستہ نہیں، زندگی کے قیام کے لئے بحری شکار کی اجازت دے دی، ارشاد ہوا۔

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○ (المائدۃ ۵: ۹۶)

"تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا، جہاں تم ٹھہرو وہاں بھی اسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لئے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو۔ البتہ خشکی کا شکار جب تک احرام کی حالت میں ہو، تم پر حرام کیا گیا ہے۔ پس بچو اُس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا۔"

قربانی کے متعلق غلط تصورات کی تردید

قربانی کے متعلق لوگوں میں عجیب عجیب طرح کے غلط تصورات قائم ہو گئے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ جو جانور اللہ کے نام پر قربان کئے جاتے ہیں ان کا خون اور گوشت اللہ تعالیٰ کو پہنچتا ہے، اس لئے عام انسانوں کو ان کا کھانا جائز نہیں۔ اس ہی لئے وہ اکثر قربانی کا گوشت اور خون خانہ کعبہ کی دیواروں سے لتھیڑتے تھے کہ اللہ کی چیز اللہ کو پہنچ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس غلط تصور کی تردید کرتے ہوئے قربانی کی حقیقت یوں بیان فرمائی:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ○

(الحج: ۳۷)

" نہ اُن کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اُسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اُس نے ان کو تمہارے لئے اس طرح مسخّر کیا ہے تاکہ اُس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی بڑائی بیان کرو اور اے نبی، بشارت دے دو نیکوکار لوگوں کو۔ "

اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی انسان خرچ کرتا ہے وہ چاہیئے روپے پیسے کی شکل میں ہو یا مال و سامان کی شکل میں یا خون و گوشت کی قربانی کی شکل میں، اللہ کو ان میں سے نہ کسی چیز کی ضرورت ہے اور نہ اس کو پہنچتی ہے، اللہ تو تمہارے اُس جذبہ اور نیت کو دیکھتا ہے جس کے تحت تم یہ مال و دولت خرچ کرتے ہو۔ اگر تم نے یہ سب کچھ خرچ کیا ہے کہ تمہاری ناموری و شہرت ہو اور لوگ تمہیں سخی اور فیاض کہیں تو اس کا صلہ تمہیں یہیں مل جائے گا، لیکن اگر تم نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ اپنے خدا کو راضی کرو اور تمہارا شمار اس کے اطاعت گزار و فرماں بردار بندوں میں ہو، تو مطمئن رہو کہ تمہارا اجر اللہ کے پاس محفوظ ہے اور وہ تمہیں اُس دن ملے گا جس دن تم کوئی چیز حاصل کرنے کی حیثیت میں نہ ہو گے اور ایک ایک چیز کے محتاج ہو گے۔

قربانی تمہارے اس جذبۂ اطاعت کی علامت و نشانی ہے جو تم اپنے خدا کو راضی کرنے کے لئے کر رہے ہو۔ اور یہ اُس جذبۂ شکر و سپاس گزاری کی علامت ہے جو تم ان نعمتوں پر کر رہے ہو جو اللہ نے تمہیں جانوروں کی شکل میں دی ہے، تم ان کا دودھ پیتے ہو، گوشت کھاتے ہو، کھالوں کو استعمال کرتے ہو، بالوں سے اون حاصل کرتے ہو اور طرح طرح کے فوائد حاصل کرتے ہو۔ ان نعمتوں کا حق ہے کہ تم منعم حقیقی کا شکر ادا کرو اور اس کی بڑائی بیان کرو کہ اُس نے یہ سب جانور تمہارے لئے پیدا کئے اور تابع فرمان کر دئے۔ جانوروں کو ذبح کرنے پر تکبیر کہنے کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ دراصل خدا کی کبریائی بیان کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

مسجد حرام کی فضیلت و مقام اور خصوصیات

بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت عطا فرمائی ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جو برکات نازل فرمائی ہیں ان کا گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور خصوصیات ہیں جن کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ مسجد حرام سے روکنا گناہِ عظیم ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ ط وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (الحج: ۲۵)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور جو (آج) اللہ کے راستے سے روک رہے ہیں اور اُس مسجد حرام کی زیارت میں مانع ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لئے بنایا ہے، جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں (ان کی روش یقیناً سزا کی مستحق ہے۔) اس مسجد حرام میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا اُسے ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔"

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے تین جرائم کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے:

کفر (نافرمانی کا رویہ اختیار کرنا یعنی اللہ تعالیٰ کو ان صفات کے ساتھ نہ ماننا جو اس نے بتائی ہیں، اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کو نہ ماننا اور اُس کے رسولوں کی اطاعت و فرماں برداری نہ کرنا۔

۲۔ اللہ کے راستے سے (اللہ کے بندوں کو) روکنا۔

یعنی جو لوگ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو قبول کر کے اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر

چلنا چاہتے ہیں، ان کو ستانا اور ان پر ظلم ڈھانا، لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر اپنی زندگی کے لئے دوسرے راستے اختیار کریں اور ایسی رکاوٹیں کھڑی کردی جائیں جن کی وجہ سے لوگوں کو اللہ کا راستہ اختیار کرنا ناممکن ہو جائے۔

۳۔ مسجد حرام کی زیارت سے لوگوں کو روکنا۔

یہ وہ مسجد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے مقرر کی ہے، جہاں جو شخص بھی جس وقت بھی آنا چاہے ہر وقت، بلا روک ٹوک آسکتا ہے۔ کسی شخص کو اس بات کا حق نہیں کہ اس پہ اپنا حق جتا کر دوسروں کو آنے سے روک سکے۔ یہاں شاہ و گدا، امیر و غریب، مقامی و غیر مقامی ہر ایک برابر ہے اور اس کے دروازے ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسا مامن ہے کہ جہاں اگر قاتل بھی پناہ لے تو اس وقت تک اس سے تعرض نہ کیا جائے گا جب تک وہ اس میں پناہ گزیں رہے۔

یہ تینوں جرائم ایسے ہیں کہ جہاں کہیں بھی کئے جائیں قابل مواخذہ ہیں۔ مسجد حرام کے ساتھ ان کا ذکر کرکے ان کی شناعت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ تو ایسا مقام ہے کہ جہاں آدمی اپنے سب گناہوں کو چھوڑ کر اللہ کے دربار میں بخشش عام کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہاں بھی آکر کفر و الحاد کی روش نہیں چھوڑتا اور اللہ ہی کے گھر میں اللہ کی بندگی کو دشوار بنا دیتا ہے تو ایسے سارے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ ہم ان کو دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ خانہ کعبہ کی بے حرمتی ایسا فعل نہیں کہ اس کو برداشت کر لیا جائے، اس کی بے حرمتی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں دونوں جگہ رسوا کرے گا اور سزا بھی دے گا۔

دوسری جگہ اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

(الانفال: ۳۴)

"لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے جب کہ وہ مسجد حرام کا راستہ روک رہے ہوں، حالانکہ وہ اس مسجد کے متولی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولی تو صرف اہل تقویٰ

ہی ہو سکتے ہیں مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے ۔"

یہاں مسجد حرام کی نسبت سے دو باتیں بیان کی گئی ہیں :

۱۔ جو لوگ مسجد حرام کا راستہ روکیں گے ، لوگوں کو حج اور عمرہ کرنے میں رکاوٹیں ڈالیں گے ، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس دنیا میں بھی سزا دے گا اور اُن لوگوں کے غلبہ کو ختم کرے گا ، تاکہ اللہ کے گھر جانے والوں کے لئے راستہ ہمیشہ کھلا رہے ۔

۲۔ اللہ کے گھر کے متولّی اور خادم صرف نیک اور پرہیز گار لوگ ہو سکتے ہیں ۔ اس کی تولیت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اس گھر کے مالک کے وفادار اور فرماں بردار بندے ہیں ۔ اگر کبھی اتفاق سے بیت اللہ کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آ بھی گیا جو اس کے اہل نہیں ہیں تو ان کا یہ غلبہ و انتظام عارضی ہوگا اور زیادہ عرصہ باقی نہ رہ سکے گا ۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہٹا کر اس گھر کی تولیت متقی اور پرہیز گاروں ہی کو عطا فرمائے گا ۔ بہت سے لوگ اپنے اقتدار کے زعم میں یہ سمجھتے ہیں کہ سب سے بڑی اہلیت اقتدار ہے ، اس لئے جس کے قبضہ میں اقتدار ہو وہ ہر منصب کا اہل اور حقدار ہوتا ہے ۔ یہ بات وہ کسی علم کی بنا پر نہیں کہتے ہیں ، بلکہ اقتدار کی جہالت میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں ۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات طے کر رکھی ہے کہ اہل ایمان کی امامت اور مرکزِ ایمان کی تولیت اللہ تعالیٰ متقی اور پرہیز گاروں کو ہی عطا کرے گا ۔ اس بات کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اس وقت ہی فرما دی تھی جس وقت حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے امامت عطا فرمائی تھی ، ارشاد ہوا :

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝ (البقرۃ : ۱۲۴)

" اللہ نے فرمایا (اے ابراہیم) میں تجھے لوگوں کا امام بناؤں گا ۔ ابراہیمؑ نے عرض کیا میری اولاد کو بھی ؟ فرمایا ، میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا ۔"

خانۂ کعبہ پر مسلمانوں کی تولیت اور امامت دنیا پر مسلمانوں کو فائز کر دینے کے اعلان کے بعد یہ ضروری تھا کہ اعلانات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں ۔

تحویلِ قبلہ اور خانہ کعبہ کی مرکزیت کا اعلان۔

اس سلسلے میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ رجب/شعبان ۲ھ میں جب کہ مسلمانوں کی ریاست دنیا میں عملاً قائم ہو چکی تھی، ان کو تحویلِ قبلہ کا حکم دیا گیا۔ اس سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اب جب مسلمانوں کی امامت دنیا میں عملاً قائم ہو چکی تھی، اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ ان کا مرکزِ دین بھی ان لوگوں سے جدا ہو جن (یہود اور نصاریٰ) کو امامت سے معزول کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے خانہ کعبہ سے بڑھ کر اس بات کا اور کون مستحق تھا کہ اس کو قبلہ قرار دیا جائے۔ یہی وہ پہلا گھر تھا جس کو خدا کے لئے خدا کے نام پر تیار کیا گیا تھا، یہی تو وہ گھر تھا جس کو دو جلیل القدر انبیاء ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل ع نے تعمیر کیا تھا، جس کے گوشے گوشے اور چپے چپے پر خدا کی راہ میں قربانیوں کی ایک طویل داستان رقم تھی۔ جو چار ہزار سال پہلے ہی قبلۂ عالم قرار دیا جا چکا تھا جس کی عزت و حرمت اور شوکت و عظمت کو دوبارہ اس کی اصلی حالت میں قائم کرنا تھا جس کو اُس اصل مقام پر واپس لانا تھا جو اغیار کی چیرہ دستیوں اور سازشوں کی وجہ سے دھندلا گیا تھا۔ چنانچہ حکم دیا گیا:۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ (البقرۃ: ۱۴۴)

"مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔"

تحویلِ قبلہ کے سلسلہ میں یہ پہلا اور ابتدائی حکم تھا جس کو سننے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ہی میں بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف رخ تبدیل کر دیا۔ اس حکم سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحویل قبلہ صرف حالت قیام کے لیے ہے اس لیے اس میں مزید وسعت پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دوسرا حکم نازل فرمایا:۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (البقرہ: ۱۴۹)

"تمہارا گزر جس مقام سے بھی ہو، وہیں سے اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام

کی طرف پھیر دو، کیونکہ یہ تمہارے ربّ کا بالکل برحق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔"

تحویلِ قبلہ کا یہ حکم اتنا عظیم الشان تھا کہ اس سے ایک ہلچل مچ گئی۔ یہود و نصاریٰ نے اپنی زبانِ طعن دراز کی کہ دیکھو ہماری مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ اب اپنا قبلہ تک علیحدہ کرلیا۔ دوسری جانب خود نئے نئے مسلمانوں میں بھی اضطراب پیدا ہوگیا۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ اس حکم پر زور دینے کے لئے اسے دوبارہ بیان فرمایا بلکہ اس کی حکمت و مصلحت بھی بیان فرما دی تاکہ ایک طرف مسلمانوں کو اس حکم کے بارے ... مینان حاصل ہو جائے تو دوسری طرف یہود و نصاریٰ کی نیش زنی کا جواب بھی مل جائے۔ پھر ارشاد ہوا:

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۚ (البقرہ: ۱۵۰-۱۵۱)

"اور جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو، اپنا رُخ مسجد حرام ہی کی طرف پھیرا کرو، اور جہاں بھی تم ہو، اُسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھو، تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ رہے ـــــ ہاں جو ظالم ہیں، اُن کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی۔ تو تم اُن سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو ـــــ اور اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کردوں اور اس توقع پر کہ میرے اس حکم کی پیروی سے تم اُسی طرح فلاح کا راستہ پاؤ گے جس طرح (تمہیں اس چیز سے فلاح نصیب ہوئی کہ) میں نے تمہارے درمیان خود تم سے ایک رسول بھیجا، جو تمہیں میری آیات سناتا ہے، تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے، جو تم نہ جانتے تھے۔"

ان آیات میں پہلے تو یہ بتایا کہ یہ حکم صرف حالت حضر کے لئے نہیں حالت سفر کے لئے بھی ہے۔ خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کے بعد اب یہ ضروری ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں خواہ اپنے گھر یا شہر میں ہوں یا دیارِ غیر میں اور حالتِ سفر میں، انھیں اب خانہ کعبہ ہی کی سمت میں منہ کرکے نماز ادا کرنا چاہیئے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تمہارے قول اور فعل میں مطابقت پیدا ہو اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ یہ لوگ مانتے تو کعبہ کو اپنا قبلہ ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ کسی کا منہ بیت المقدس کی طرف ہے اور کسی کا کعبہ کی طرف۔

رہی اغیار کی زبان درازی اور طعنہ زنی تو تم ان کا منہ کسی طرح بند نہیں کر سکتے۔ تم بیت المقدس کی طرف منہ کرو، تو یا خانہ کعبہ کی طرف کرو تو، وہ تم سے کسی طرح راضی نہ ہوں گے اور تمہاری ہر بات میں سو عیب نکالیں گے۔ اس لئے لوگوں کی باتوں پر نہ جاؤ اور نہ اُن سے ڈرو، بلکہ اُس اللہ سے ڈرو اور اُس کے احکام کی پیروی کرو جس نے تمہیں حالت خوف سے نکال کر ایک آزاد ریاست عطا کی، دنیا کی امامت پر سرفراز کیا اور "خیر امت" کا مقام عطا کیا۔

تحویلِ قبلہ ــــــــ ایک انعام

مزید یہ کہ یہ حکم تمہارے لئے اسی طرح کا ایک انعام ہے جیسا انعام اللہ تعالیٰ نے تمہیں رسولِ عربی عطا کر کے کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تم آخری امت بنے، ان ہی کی بدولت تمہیں دولتِ ایمان نصیب ہوئی۔ ان ہی کی بدولت تم پیغام الٰہی کے علم بردار بنے اور اب ان ہی کی بدولت تمہیں یہ امامت عالم عطا کی جا رہی ہے۔ اس امامت کے بارے لوگوں کے ذہنوں میں جو ابہام باقی تھا اسے دور کرنے کے لئے یہ تحویل قبلہ کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ تمہارے مستقل وجود، علیحدہ امت اور امامِ عالم ہونے پر مہر لگ جائے اور مشرکین و اہل کتاب ہمیشہ کے لئے تم سے مایوس ہو جائیں کہ تم ان سے کبھی مل سکو گے۔

اِخراجِ مشرکین

تحویلِ قبلہ کے بعد اور خانہ کعبہ کو مرکزی حیثیت دیدینے کے بعد یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس کے بارے میں مشرکین عرب کی خصوصاً اور اہل کتاب کی عموماً حیثیت کو متعین کر دیا جائے تاکہ اس ہی کی روشنی میں بیت اللہ کے بارے میں ان کے رویہ کو متعین کیا جا سکے۔

اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ بیت اللہ اور اس کے جوار کو مشرکین سے پاک کر دیا جائے تاکہ اُن کی جسمانی اور روحانی ناپاکی حرم بیت اللہ کے پاکیزہ ماحول پر اپنا سایہ نہ ڈال سکے اور زائرین بیت اللہ کے لئے تمام راستے محفوظ و مامون ہو جائیں چنانچہ ارشاد ہوا:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (التوبة : ۳)

"اطلاعِ عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری ہے اور اس کا رسول بھی۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے لئے ہی بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اے نبی! انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوش خبری سنا دو۔"

یہاں مشرکین کو آخری الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اب تک وہ ظلم و ستم کرتے رہے ہیں، جو سازشیں اور شرارتیں کرتے رہے ہیں، ان کے خاتمہ کا وقت آ گیا ہے۔ اب یا تو وہ سیدھی طرح اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں، اپنے جرائم سے توبہ کریں اور مطیع و فرماں بردار بن کر رہیں۔ یا اگر یہ منظور نہیں تو اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہیں۔ وہ سمجھ لیں کہ ان کا مقابلہ کچھ انسانوں سے نہیں، بلکہ ان انسانوں کے رب سے ہے جو اللہ ہے، اللہ کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔ جب چاہے گا ان کو مسل ڈالے گا۔ وہ ان کو نہ صرف اس دنیا میں سزا دے کر ذلیل و خوار کرے گا۔ بلکہ اس کے بعد آخرت میں بھی اس کی سزا سے تمہارا نہ چھوٹے گا۔ وہاں جو عذاب ہے وہ اس سے زیادہ دردناک اور خوف ناک ہے جو اس دنیا میں انھیں ملے گا۔

پھر مشرکین سے اس اعلانِ براٴت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ

عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۗ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (التوبة: ۷،۸)

"ان مشرکین کے لئے اللہ اور اُس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہو سکتا ہے؟ ــــــ بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا۔ تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو۔ کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ــــــ مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا۔ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور اُن میں سے اکثر فاسق ہیں۔"

چند عملی ہدایات

اس اعلانِ عام کے بعد ان مشرکین کے استیصال کے لئے چند عملی ہدایات دی گئیں۔ ارشاد ہوا:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبة: ۵)

"پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں اُن کی خبر لینے کے لئے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

۹ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی سرکردگی میں جو حج ادا کیا گیا تھا، اس میں مشرکین کو وہ الٹی میٹم دیا گیا تھا جو آیتِ مندرجہ بالا (التوبہ : ۱۳) میں دیا گیا تھا۔ اس ہی موقع پر مشرکین سے اظہارِ برأت کیا گیا تھا اور انھیں چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی کہ وہ اس مدت میں اپنے متعلق غور کرلیں اور اپنی حیثیت متعین کرلیں۔ ارشاد ہوا :-

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (التوبہ : ۱،۲)

"اعلانِ برأت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یہ کہ اللہ منکرینِ حق کو رسوا کرنے والا ہے۔"

یہ اعلانِ برأت ان تمام مشرکین سے تھا جو بظاہر تو مسلمان سے ان کی حمایت کا معاہدہ کر رکھتے تھے، لیکن ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جب موقع ملے تو مسلمانوں کے دشمنوں سے مل کر اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کا تختہ الٹ دیں۔ قبل اس کے کہ مشرکین کوئی اقدام کرتے، اللہ تعالیٰ نے ان کی چالوں کو ناکام بنادیا اور ان کو الٹی میٹم دے دیا کہ ان چار ماہ میں (یعنی ۱۰ ذی الحج ۹ھ سے ۱۰ ربیع الثانی ۱۰ھ تک) اپنے متعلق فیصلہ کرلیں کہ آیا وہ ملک چھوڑ کر کہیں اور جانا چاہتے ہیں یا مسلمان بن کر اس ہی ملک میں رہنا بسنا چاہتے ہیں یا اس اسلامی حکومت سے ٹکرا کر ہمیشہ کے لئے اپنا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو وہ ہدایات دی گئیں جن پر عمل کرکے وہ نہ صرف مشرکین کی سرکوبی کرسکتے تھے، بلکہ سرزمینِ عرب کے ذرّے ذرّے کو ان نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک کرسکتے تھے جن سے ان مشرکین نے انھیں آلودہ کردیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

"پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو۔"

یہاں حرام مہینوں سے وہ چار مہینے مراد ہیں جن کی انھیں مہلت دی گئی تھی۔ اب ان کی شرارتیں اور ریشہ دوانیاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ انھیں مزید مہلت دینا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا تھا۔ ان کی سزا یہی تھی کہ جہاں کہیں بھی ملیں وہاں ان کو مارا جائے، ان کی ہر وقت کڑی نگرانی رکھی جائے اور جہاں قابو میں آجائیں وہاں ان کو کچل دیا جائے۔ اس تمام دار و گیر کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ ان کی شرارتوں اور خباثتوں سے نجات حاصل کی جائے، لیکن اگر یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں، اسلام لائیں اور اسلامی شعار کو مثلاً نماز اور زکوٰۃ کو اختیار کریں، تو پھر یہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور ان تمام حقوق کے حق دار ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

یہاں ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری دو شرطوں پر دی گئی، ایک یہ کہ وہ نماز ادا کریں، کیونکہ نماز وہ اولین فریضہ ہے جو ایک مسلمان کو ادا کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "مسلمان اور کافر میں فرق کرنے والی چیز نماز ہے۔"

دوسرے یہ کہ وہ زکوٰۃ ادا کریں، کیونکہ جہاں کہیں نماز کا حکم دیا گیا ہے وہیں زکوٰۃ کی ادائیگی کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرنے والا مومن نہیں ہو سکتا۔

جھوٹی دینداری کا قلع قمع

اس ہی سلسلے میں مشرکین عرب کے عموماً اور مشرکین قریش کے خصوصاً اس جھوٹے پندار کو بھی منہدم کیا گیا جو کعبہ کی مجاوری کی وجہ سے انھوں نے قائم کر رکھا تھا اور ان کی اس جھوٹی دینداری کا لبادہ بھی چاک کر دیا گیا جو انھوں نے اوڑھ رکھا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:-

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (التوبہ: ۱۷-۱۹)

"مشرکین کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور و خادم بنیں درآنحالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ ان کے تو سارے اعمال ضائع ہو گئے اور جہنم میں انھیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ انہی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ اور روزِ آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔"

بیشک اللہ کی مسجدوں، خصوصاً بیت الحرام کی خدمت کرنا، ان کا انتظام کرنا، ان کی صفائی کرنا، ان کی تزئین کرنا اور خدمت کرنا بڑی نیکی کے کام ہیں لیکن یہ کام ان ہی لوگوں کو زیب دیتے ہیں جو ان گھروں کے مالک ——— اللہ ——— پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ جو لوگ اللہ ہی پر ایمان نہ رکھتے ہوں، اس کے بھیجے ہوئے پیغام کو ماننے سے انکار کرتے ہوں، اس کے پیغمبروں کو نہ صرف رد کرتے ہوں بلکہ ان کا مذاق اڑاتے ہوں، ان کو ستانے اور زک دینے کے لئے دن رات نئے نئے جتن کرتے ہوں، وہ لوگ اس بات کے کیسے مستحق ہو سکتے ہیں کہ اللہ کے گھروں کو آباد کریں اور ان کے مجاور و خادم بنیں۔

اللہ کے گھروں کو آباد کرنے اور اُن کی خدمت کرنے کا حق تو صرف انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جو خود اللہ پر ایمان رکھتے ہوں، اس بات پر ایمان رکھتے ہوں کہ ایک دن اللہ ان کے سارے اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور اُن پر جزا و سزا دے گا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار اور فرمانبردار بندے ہوں اور اس اطاعت و فرمانبرداری کے ثبوت میں نماز کا نظام قائم کرتے ہوں اور جو مال اللہ نے دیا ہے اس میں سے اللہ کا حق ——— زکوٰۃ ——— ادا کرتے ہوں۔

تم لوگ اگر سمجھتے ہو کہ ایمان کے بغیر محض چند ظاہری کام مثلاً حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجدِ حرام کی خدمت کرنا ہی بہت بڑی نیکی ہے اور نجات کے لئے کافی ہے، تو یہ تمہاری غلط فہمی

ہے۔ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کے بغیر ان کاموں کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایمان کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ اصلاً یہ لوگ اللہ کے باغی ہیں اور باغیوں کا کوئی کام بھی قابل قدر نہیں، خواہ وہ بذات خود کتنا ہی بڑا اور نیک کام کیوں نہ ہو۔ جو لوگ اللہ پر، یوم آخرت پر، اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اپنی جانیں لڑا دیں، اپنا مال خرچ کیا، اپنے گھر بار لٹا دیئے وہ آخر ان لوگوں کے برابر کیسے کر دیئے جائیں گے جو دن رات تو اللہ کا کلمہ نیچا کرنے کے لئے تگ و دو کرتے ہوں، لیکن چند نیک کام آرام سے بیٹھے ہوئے انجام دے رہے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ دونوں گروہ ہرگز برابر نہیں اور اللہ کی ہدایت کے دروازے ان لوگوں پر بند ہیں جو نیکی کا یہ تصور رکھتے ہیں۔

مشرکین کے داخلہ پر پابندی۔

ان لوگوں کی مذہبی حیثیت کی حقیقت بتانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جس طرح ان لوگوں پر اللہ کی ہدایت کے دروازے بند ہیں اسی طرح اب ان لوگوں پر اللہ کے گھر کے بھی دروازے بند رہیں گے۔ ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (التوبہ: ۲۸)

"اے ایمان لانے والو، مشرکین ناپاک ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں اور اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔"

مشرکین عرب سینکڑوں سال سے اپنے مشرکانہ عقائد و اعمال کی خباثتوں سے سرزمین حرم کو گندا کر رہے تھے، اب وقت آگیا تھا کہ اس پاک سرزمین کو ان کے وجود سے پاک کیا جائے اور اور اب دیار حرم اس ہی پاک فضا سے معطر ہو جائے جیسی ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے زمانے میں تھی۔ توحید و رسالت کی عطر بیز ہوائیں پھر سے قلب و روح کو تازگی و لطافت عطا کریں۔ چنانچہ ۹ھ سے سرزمین مکہ میں مشرکین کا داخلہ قطعاً بند کر دیا گیا اور یہ "بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ" کفر و شرک کی غلاظتوں

سے ہمیشہ کے لئے پاک و صاف کر دیا گیا۔

رزق کے خزانے اللہ کے پاس ہیں

مشرکین کے اس طرح اخراج اور داخلہ پر پابندی سے، ممکن ہے بعض ذہنوں میں یہ خیال آیا ہو کہ اس طرح تو ہماری معیشت تباہ ہو جائے گی۔ خریداروں کی ایک بڑی تعداد ہمارے ہاتھوں سے جاتی رہے گی اور ہم تنگ دستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ان سب واہموں کو اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دور کر دیا کہ

"اگر تمہیں تنگدستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔"

رزق کی کنجیاں صرف اللہ کے پاس ہیں۔ اگر کسی وجہ سے کوئی ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو وہ دس دروازے کھول دیتا ہے۔ دراصل یہ انسان کی تنگ خیالی ہے کہ انسان رزق کو صرف ایک دو سے وابستہ سمجھتا ہے، ورنہ اللہ کا دامن رحمت تو بہت وسیع ہے۔ سچ فرمایا نبی پاک ؐ نے کہ:

"اگر تم اللہ پر بھروسہ کرو تو اللہ تمہیں اسی طرح رزق دے گا جس طرح چڑیوں کو دیتا ہے۔ کوئی چڑیا ایسی نہیں جو صبح کو خالی پیٹ اپنا گھونسلا چھوڑتی ہو اور شام کو شکم پر نہ آتی ہو۔"

اگر مشرکین کے دیار حرم خالی کرنے سے کمی واقع ہوتی بھی تو مسلمانوں کی روز افزوں تعداد سے حاجیوں کی کثرت بھی ہوتی اور خریداروں کا تانتا بندھا رہتا۔ یہ تو صرف ایک پہلو تھا۔ کیا اللہ کے پاس رزق دینے کا ایک ہی راستہ ہے؟ اس کے خزانوں میں تو کوئی کمی نہیں۔ اس کے خزانوں میں تو رنگا رنگ رزق کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ خود اُس زمانہ ہی میں دیکھ لیا کہ چند سالوں ہی میں فتوحات کی کثرت کی وجہ سے اتنا مال آیا کہ عرب کے چرواہوں کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن نظر آنے لگے۔

پھر آج ڈیڑھ ہزار سال کے بعد بھی اگر کوئی اللہ کی رزاقیت کا نظارہ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے عرب کی بے آب و گیاہ زمین میں جہاں نہ زراعت، نہ صنعت، نہ جدید تمدن کی خیرہ کن چمک دمک اور نہ مادی وسائل کی فراوانی، لیکن دیکھئے اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین کے بطن سے پٹرول کے چشمے بہائے کہ دیکھتے دیکھتے آج بھی عرب دنیا کی مالدار ترین قوم بن گئے۔ اور ابھی تک اس کے خزانوں

ہیں معلوم نہیں کیا کیا بھرا پڑا ہے، ذرا اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار تو کر کے دیکھو پھر دیکھو اس کے رزق کے کتنے دریا بہتے ہیں۔ اب بھی اگر کوئی اللہ کی رزاقیت پر یقین نہ رکھے تو یہ اس کی اپنی ہی کوتاہ بینی ہے -

---

معمارِ حرم کی واپسی

تعمیرِ حرم اور برکاتِ حرم کے اس مختصر تذکرہ کے بعد ہم پھر معمارِ حرم کے حالات بیان کرتے ہیں۔

قربانیٔ اولاد کے امتحان میں ابراہیمؑ نے جس عزیمت اور تسلیم کا مظاہرہ کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے دربار سے جانوروں کی قربانی کا انعام ملا اور اولاد کی قربانی کے بجائے ہر سال اُس یعنی ۱۰ ذی الحج کو جانوروں کی قربانی کو سنتِ ابراہیمی قرار دیا۔ ابراہیمؑ یہ انعام لے کر اب گھر واپس ہونے لگے۔ شاید آپ واپسی پر اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ سے بھی ملے ہوں جو آپ کی راہ میں "سدوم" میں قیام پذیر تھے اور آپ کے پیغام کو پھیلا رہے تھے اور آپ کی نیابت فرما رہے تھے۔ یہاں سے ہوتے ہوئے آپ اپنے مستقر "بیت المقدس" تشریف لائے۔ یہاں پہنچ کر ایک نیا واقعہ پیش آیا جس نے تاریخ عالم پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں

حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی بشارت

اب تک ابراہیمؑ کے صرف ایک ہی فرزند حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ ان اللہ کے حکم کے تحت مکہ کی ویران اور بنجر زمین میں چھوڑ آئے تھے اور اُن کے ساتھ ہی ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کو بھی وہیں چھوڑ دیا تھا۔ اب آپ اپنی دوسری اہلیہ حضرت سارہ کے ساتھ تنہا رہ رہے تھے۔ اب آپ کو فکر ہو گی کہ میرا بڑھاپے کا زمانہ ہے، اس وسیع اور شاداب قطعہ زمین پر میرے بعد اللہ کا پیغام کون سنائے گا اور انسانوں کو راہِ راست کون دکھائے گا؟ ایک بیٹا تھا وہ بھی اللہ کے حکم کے تحت، مکہ کی ویران اور بنجر زمین میں چھوڑ آیا۔ ایک بھتیجا لوطؑ جو میری رسالت پر ایمان لایا تھا۔ اس کو بھی سینکڑوں میل

دور دراز کے علاقہ میں اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے بھیج دیا۔ کیا یہ وسیع و عریض خطہ یوں گمراہی میں بھٹکنے کے لئے چھوٹا رہے گا اور یہاں اللہ کا پیغام بلند نہ ہو سکے گا؟ آپ ان ہی افکار میں غلطاں و پیچاں ہوں گے کہ اچانک کچھ اجنبی لوگ آپ کے یہاں آئے۔ یہ کون تھے؟ اور کس لئے آئے تھے؟ ان تمام اسرار پر سے اللہ تعالیٰ نے یوں پردہ اٹھایا ہے۔

اجنبی مہمان

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرٰهِيمَ ۝ (الحجر : ۵۱)

"اور انھیں ذرا ابراہیم کے مہمانوں کا قصہ سنادو۔"

دوسری جگہ یوں ذکر کیا :-

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرٰهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ۝

(الذاریٰت : ۲۴)

"اے نبی، ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے۔"

یہاں تھوڑی سی تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا کہ یہ مہمان معزز تھے۔ اپنی صورت شکل، اپنے لباس اپنی چال ڈھال سے شریف اور محترم معلوم ہوتے تھے۔ جب یہ معزز مہمان آپ کے یہاں آئے تو اسلامی طریقہ پر شرفاء کی طرح انھوں نے سلام کیا۔

إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلٰمًا ط (الحجر : ۵۲)

"جب وہ اس کے یہاں آئے تو کہا آپ کو سلام ہے۔"

إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلٰمًا ط قَالَ سَلٰمٌ ط قَوْمٌ مُّنْكَرُونَ ۝

(الذاریٰت : ۲۵)

"جب وہ اس کے ہاں آئے تو کہا آپ کو سلام ہے۔ اس نے کہا "آپ لوگوں کو بھی سلام ہے —— کچھ نا آشنا سے لوگ ہیں۔"

اجنبیوں کے اس طرح بے تکلفی سے آنے پر آپ کو کچھ تعجب ہوا لیکن آپ نے اس تعجب کو ظاہر نہ ہونے دیا بلکہ پیغمبرانہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ فوراً ہی ان کی تواضع کرنے کے لئے مکان کے اندر تشریف لے گئے اور ایک بھنا ہوا بچھڑا لے کر باہر آئے قرآن مجید میں اس کو

یوں بیان کیا گیا ہے۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝ (الذٰریٰت: ۲۶)

"پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لا کر مہمانوں کے آگے پیش کیا۔"

سورہ ہود میں ان کے آنے کے مقاصد پر تھوڑی روشنی یوں ڈالی گئی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ (ھود: ۶۹)

"اور دیکھو، ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لئے پہنچے۔ کہا تم پر سلام ہو، پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا (ان کی ضیافت کے لئے) لے آیا۔"

اکرامِ مہمان ——— پیغمبرانہ اخلاق

مہمانوں کی ضیافت تمام متمدن قوموں میں مہذب ہونے کی علامت ہے۔ قبائلی زندگی میں تو یہ لازمۂ حیات ہے۔ آج بھی جہاں جہاں قبائلی زندگی پائی جاتی ہے، وہاں عموماً اور عربوں میں خصوصاً مہمانوں کی تواضع اور ضیافت، شرافت کی نشانی اور تہذیبی خصوصیات میں سے ہے۔ اسلام نے مہمانوں کی تواضع کا رتبہ اس درجہ بڑھایا کہ اس کو پیغمبرانہ اخلاق کے جزو کے طور پر پیش کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اُكْرِمُوْا ضُيُوْفَكُمْ

"اپنے مہمانوں کی عزت کرو۔"

دوسری جگہ اس کو ایمان کا تقاضہ بتایا ہے۔ فرمایا۔

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ

"جو لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اپنے مہمانوں کی خاطر داری کریں۔"

چنانچہ اسی پیغمبرانہ اخلاق کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جوں ہی مہمان پہنچے۔ آپ نے فوراً ہی مہمانوں سے پوچھے بغیر ہی کھانے کا انتظام کر لیا۔ پھر کھانا بھی معمولی دال روٹی نہیں بلکہ بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا۔ یہیں سے ہمیں معلوم ہوا کہ مہمانوں کو بہتر سے بہتر کھانا پیش کرنا پیغمبرانہ سنت

ہے ۔جب کھانا لگادیا گیا تو آپ اپنے معزز مہمانوں کے پاس بیٹھے اور کھانے کے لیے کہا:

فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ (الذّٰریٰت: ۲۷)

"پھر کھانا ان کے قریب کیا اور کہا آپ کھاتے کیوں نہیں ۔"

آپ کی اس فرمائش کے بعد بھی جب مہمانوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا تو آپ کچھ کھٹکے۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ (ھود: ۷۰)

"جب آپ نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے تو آپ دل میں ڈرے"

دوسرے مقام پر آپ کی کیفیت کو مختصراً یوں بیان کیا گیا ہے ۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ (الذاریٰت: ۲۸)

"پھر وہ اپنے دل میں اُن سے ڈرا ۔"

آپ کا یہ خوف بلاوجہ نہ تھا۔ اجنبی مہمان، باہر سے آئے ہوئے مسافر، قبائلی طریقۂ مہمانداری کے خلاف، میزبان کی دعوت قبول نہ کرنا سو اندیشے پیدا کر سکتا تھا۔ پہلے ہی دل میں کہہ چکے تھے "قوم منکرون" کچھ ناآشنا لوگ سے ہیں۔ اب یقین ہو چلا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے ۔ ممکن ہے کہ آپ نے سوچا ہو کہ یہ کسی اور نیت سے آئے ہوں جب کھانا نہیں کھاتے تو مہمانی کے سوا کچھ اور ہی مقصد ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب کھانا نہ کھاتے دیکھا تو اس کی وجہ پر غور کیا ہو اور پیغمبرانہ فراست سے یہ تاڑ لیا ہو کہ یہ فرشتے ہیں جو انسانی شکل میں آئے ہیں۔ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا خود غیر معمولی واقعہ ہے۔ خیال کیا ہو، خدا خیر کرے یہ کسی خاص مہم پر آئے ہیں۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو۔ آپ نے ان کے اس رویہ پر اپنی تشویش کا یوں اظہار کیا:

قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ۝ (الحجر: ۵۲)

"(ابراہیم) نے کہا ہم تو تم سے ڈرتے ہیں ۔"

مہمانوں نے جب ابراہیم ؑ کی یہ حالت دیکھی تو انھیں زیادہ دیر تک تشویش میں مبتلا رکھنا مناسب نہ سمجھا اور بولے:

قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ (الذّٰریٰت: ۲۸)

"بولے ڈرو نہیں، اور اس کو ذی علم بیٹے کی بشارت دی۔"

دوسری جگہ اس کو یوں بیان کیا گیا ہے:

قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ۝ (الحجر: ۵۳)

انھوں نے کہا کہ تم ڈرو نہیں، ہم تو تمہیں ذی علم لڑکے کی بشارت دینے آئے ہیں۔"

یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کے ڈرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہچان گئے تھے کہ یہ فرشتے ہیں جو انسانی شکل میں آئے ہیں اور فرشتے جب بھی انسانی شکل میں آتے ہیں کسی خاص مہم پر آتے ہیں، جیسے بابل میں ہاروت و ماروت آئے تھے چنانچہ آپ کو خوف ہوا کہ یہ کوئی نئی آزمائش تو نہیں آئی یا کسی کی شامت نازل کرنے تو نہیں آئے ہیں۔

فرشتوں نے نہ صرف بشارت دے کر ان کا خوف دور کیا بلکہ مزید تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ شامت تمہاری یا تمہارے اہل و عیال یا قوم کی نہیں آئی ہے۔ بلکہ کسی اور ہی قوم کی شامت آئی ہے اور اس کی تشریح یوں کی:

قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ۝ (هود: ۷۰)

"بولے ڈرو نہیں، ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔"

یعنی تم خوش ہو جاؤ کہ ایک تو تمہیں بیٹے کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ تم اور تمہارے اہل و عیال سب محفوظ ہیں، شامت تو قوم لوط کی آئی ہے اور ہم اسی مہم پر آئے ہیں۔

دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بشارت فرزند کے فوراً ہی بعد قوم لوطؑ کی طرف مہم کی اطلاع نہیں دی بلکہ اس بشارت اور اطلاع مہم کے درمیان مزید گفتگو ہوئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

بشارت پر تعجب

فرشتوں نے جب حضرت ابراہیمؑ کو پیدائش فرزند کی بشارت دی تو انھیں اس بشارت پر بڑا تعجب ہوا اور بولے:

قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَن مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ۝ (الحجر: ۵۴)

"ابراہیم نے کہا، کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟"

روایات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کی عمر اس وقت ۱۰۰ سال اور ان کی اہلیہ حضرت سارہ کی عمر تقریباً ۹۰ سال تھی، اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ قانون طبعی کے تحت ان کی عمریں اس حد سے تجاوز کر چکی تھیں جب اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اس ہی لئے انھوں نے اس اَن ہونی بات پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ اس بڑھاپے میں اور پیدائش اولاد ——— یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے اور بظاہر ناممکن ——— وہ تو اب اولاد کا خیال بھی دل سے نکال چکے تھے۔ فرشتوں نے جب یہ سنا تو بولے:

قَالُوا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ۝ (الحجر: ۵۵)

"انھوں نے جواب دیا، ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں، تم مایوس نہ ہو۔"

ابراہیمؑ نے جب فرشتوں سے یہ جواب سنا تو بولے:

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۝ (الحجر: ۵۶)

"ابراہیم نے کہا، اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔"

یعنی یہ سوال و جواب کسی مایوسی یا شک و شبہ کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت حال کو سمجھنے کی جستجو ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو اس بشارت پر کامل یقین رکھتا ہوں کیونکہ رحمتِ حق سے تو وہی مایوس ہوتا ہے جو راہ گم کردہ ہے اور پھر تو یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے اپنی ہدایت سے نوازا ہے۔

حضرت سارہ کی حیرانی

اس ہی اثنا میں حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ حضرت سارہ بھی یہ سن کر کہ ان کے گھر میں فرشتے انسانی شکل میں آئے ہیں، باہر نکل کر آگئیں۔ یہ آنا اشتیاقِ دید بھی ہو سکتا ہے کہ دیکھیں فرشتے کیسے ہوتے ہیں اور اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ آخر نبی کی بیوی تھیں، اتنا تو سمجھتی ہی ہوں گی کہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا کسی بڑی آفت کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ جب انھوں نے ابراہیمؑ اور فرشتوں کو گفتگو کرتے دیکھا تو سننے کے لئے کھڑی ہو گئیں،

انھوں نے جب سنا کہ فرشتے پیدائش فرزند کی بشارت دے رہے ہیں تو اُن سے نہ رہا گیا اور بے اختیار ہنس پڑیں۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ (ھود: ۷۱)

"اور اس کی (ابراہیم کی) بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی، وہ یہ سن کر ہنس دی۔"

ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ فرشتے کیسی ان ہونی باتیں کر رہے ہیں۔ انھیں بڑا تعجب ہوا اور خوشی بھی ہوئی ہوگی۔ ان ہی ملے جلے جذبات کے تحت وہ بے اختیار ہنس پڑیں۔ فرشتوں نے جب ان کو اس بشارت پر تعجب کرتے دیکھا تو اللہ کے حکم سے انھوں نے وہ بشارت انھیں براہِ راست اور واضح الفاظ میں سنادی۔

فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ (ھود: ۷۱)

"پھر ہم نے اس کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی۔"

یعنی صرف بیٹے حضرت اسحاق ؑ کی ہی بشارت نہ دی بلکہ پوتے حضرت یعقوب ؑ کی بھی بشارت دے دی کہ یہ بیٹا نہ صرف پیدا ہوگا بلکہ جوان ہوگا اور اُس سے بھی ایک بیٹا یعقوب پیدا ہوگا۔ دوسری جگہ آتا ہے کہ اس بشارت میں یہ بات بھی بتادی گئی تھی کہ یہ بیٹا نبی بھی ہوگا۔

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (الصّٰفّٰت: ۱۱۲)

"اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔"

اب تو حضرت سارہ کے تعجب کی انتہا نہ رہی، بے اختیار بول پڑیں،

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ (ھود: ۷۲)

"وہ بولی، ہائے میری کم بختی، کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جب کہ میں بڑھیا پھونس ہوگئی اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔"

فرشتوں نے کہا:

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝ (ھود: ۷۳)

"وہ بولے ، اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم کے گھر والو ! تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں ، اور یقیناً اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے ۔"

فرشتوں نے بتایا کہ اس بشارت میں تعجب کی کون سی بات ہے ۔ جس گھر پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہر دم نازل ہوتی ہوں ، جن کی اللہ قدم قدم پر اعانت وامداد کرتا ہے ، ان کو اگر بڑھاپے میں ، جب کہ عام طور پر اولاد نہیں ہوتی ، اپنی رحمتِ خاص سے اولاد عطا کردے تو تعجب کرنا عجیب بات ہے ۔

اتنی واضح اور غیر مبہم گفتگو کے بعد حضرت سارہ نے خالص نسوانی ردعمل کا اظہار کیا :

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝

"یہ سن کر اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی "بوڑھی بانجھ ۔" (الذّٰریٰت : ۲۹)

اُس وقت حضرت سارہ کی عجیب حالت ہوئی ہوگی ۔ ایک طرف اولاد ہونے کی خوشی دوسری طرف حیرانی و پریشانی ، یہ سب کچھ ہوگا کیسے ۔ تیسری طرف دنیا والوں کی باتوں اور مبارک بادوں کا منظر ۔ ان سب باتوں نے ان کو عجیب مخمصے میں مبتلا کردیا ۔ بولیں ، سب کچھ صحیح ہے لیکن میں تو بوڑھی بھی ہوں اور بانجھ بھی ، یہ کیسے ممکن ہے ۔ وہ اس سے زیادہ کہہ بھی کیا سکتی تھیں ۔

فرشتوں نے جواب دیا :

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝ (الذّٰریٰت : ۳۰)

"انھوں نے کہا ، یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے ۔ وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے ۔"

یعنی تم چاہو یا نہ چاہو ، مانو یا نہ مانو ، یہ تو ہونے والا ہے اور یہی تمہارے رب کا فیصلہ ہے ۔ اس بشارت کی تکمیل کس طرح ہوگی ۔ یہ بھی وہ اچھی طرح جانتا ہے اور اس کام میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں ، اس سے بھی وہ واقف ہے ۔ اس کے کاموں کی حکمتوں کو سمجھنا انسانوں کے بس کی بات نہیں ۔

قوم لوط اور اس کا انجام

حضرت ابراہیمؑ یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ فرشتوں کی بشارت نے دل باغ باغ کر دیا۔ وہ خوف و اضطراب جو ابتدا میں پیدا ہوا تھا دور ہو گیا۔ اولاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حتمی فیصلہ سننے کے بعد اب قدرے اطمینان ہوا کہ یہ فرشتے ہماری طرف کوئی عذاب لے کر نہیں آئے ہیں لیکن ابھی دل میں یہ کھٹک باقی تھی کہ فرشتے اس غیر معمولی ہیئت میں اگر ہماری طرف کسی مہم پر نہیں آئے ہیں تو آئے کس کی طرف ہیں؟ چنانچہ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی فکر ہوئی اور یوں گویا ہوئے۔

فرشتوں کے مشن کے متعلق استفسار

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ (الحجر: ۵۷)

"(ابراہیم نے) کہا کہ اے اللہ کے فرستادو! کس مہم پر آئے ہو؟"

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ (الحجر: ۵۸)

"انھوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔"

دوسری جگہ بھی یہی جواب بالکل ان ہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ (الذّٰریٰت: ۳۱-۳۲)

"ابراہیم نے پوچھا، اے فرستادگان الٰہی! آپ کس مہم پر بھیجے گئے ہیں، فرشتوں نے کہا ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔"

یہ مجرم قوم کون تھی؟ اس کا کیا جرم تھا؟ فرشتوں نے اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس کی بدکرداری اور اس کی مجرمانہ ذہنیت اس درجہ آشکار تھی کہ اس کا نام لینے کی ضرورت ہی نہ

تھی۔ صرف لفظ "مجرم قوم" کہہ دینا ہی اس کے تعارف کے لئے کافی تھا۔ اگلی آیات بتاتی ہیں کہ یہ مجرم قوم حضرت لوط علیہ السلام کی امت تھی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ آپ کی اہلیہ کے سوا حضرت ابراہیمؑ کی قوم میں واحد شخص جو ایمان لایا وہ صرف حضرت لوطؑ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے خاندان، اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑ کر ہجرت اختیار کی تو اس سفر میں آپ کی اہلیہ حضرت سارہ کے علاوہ حضرت لوطؑ ہی آپ کے ساتھ تھے۔ سعید بخت ایسے کہ اللہ تعالیٰ نے کم سنی ہی میں آپ کو دولتِ ایمان سے مالا مال کیا۔ اس پر فضلِ مزید یہ کہ جب بڑے ہوئے تو خلعت نبوت سے نوازے گئے ؏:

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے (جوہر)

قوم لوطؑ کی اخلاقی بے راہ روی

حضرت ابراہیمؑ جب مصر سے واپس ہوئے تو اردن کے علاقے میں حضرت لوطؑ کو اپنا جانشین و خلیفہ بنایا اور سدوم کو، جو اس علاقہ کا صدر مقام تھا، آپ کا مستقر ٹھہرایا۔ اس قوم کے سنگین جرائم میں سے سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ یہ قوم "لواطت" جیسے قبیح فعل کی موجد تھی اور اس میں اس درجہ غرق تھی کہ یہ فعل شنیع اس ہی قوم کے نام سے منسوب ہوگیا۔ مسافروں اور مہمانوں کو لوٹنا اور ان کو بے عزت کرنا ان کا معمول تھا۔ بائبل اس قوم کے جرائم کی روداد سے بھری ہوئی ہے۔ اس ناہنجار قوم کو لوط علیہ السلام نے سمجھانے اور راہِ ہدایت دکھانے کی بہتیری کوشش کی لیکن اس قوم کی مجرمانہ ذہنیت نے اُسے اس قابل نہ رکھا تھا کہ وہ کسی نصیحت کو سنتی اور اپنے اعمال کو درست کرتی۔ اس نے لوطؑ کے تمام وعظ و نصیحت کا صلہ یہ دیا کہ آپ کو اپنی سرزمین سے نکال دینے کی دھمکی دی۔ اس بدبخت قوم کے جرائم کی مختصر مگر جامع روداد قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ۝ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُسْرِفُونَ ۝ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ۝ (الاعراف: ۸۰-۸۲)

"اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا، پھر یاد کرو جب اُس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو

مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے، بڑے پاک باز بنتے ہیں یہ۔"

یہ ہے اس قوم کے جرائم پر قرآنِ مجید کی شہادت۔ ایک بدکار قوم کے یہی لچھن ہوتے ہیں کہ جب کوئی مصلح اُسے نصیحت کرتا ہے تو اس کا احسان مند ہونے کے بجائے اس کو نکالنے کی فکر کرنے لگتی ہے اور یوں اپنے درمیان سے ہیروں کو اٹھا کر پھینکتی ہے اور کوئلوں کو جمع کرتی ہے "تاکہ عذابِ الٰہی کی آگ آئے اور اُسے بھسم کر دے۔

دوسرے مقام پر اس کی مزید تفصیل یوں ملتی ہے:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (العنکبوت: ۲۸-۳۰)

"اور ہم نے لوط کو بھیجا جب کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا: "تم تو وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے؟ کیا تمہارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بُرے کام کرتے ہو؟" پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انھوں نے کہا "لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے۔" لوط نے کہا "اے میرے ربّ، ان مفسد لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔"

اُن کی اس مجرمانہ روش کا بیان تیسری جگہ یوں کیا گیا ہے:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝
اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ
اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا
اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝

(النمل ۲۷: ۵۴-۵۶)

"اور لوط کو ہم نے بھیجا۔ یاد کرو وہ وقت جب اُس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم آنکھوں دیکھتے بدکاری کرتے ہو؟ کیا تمہارا یہی چلن ہے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لئے جاتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ سخت جہالت کا کام کرتے ہو۔" مگر اُس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا "نکال دو لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔"

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ یہ قوم اس قبیح فعل کی بانی ہی نہ تھی بلکہ کھلے بندوں اس کا ارتکاب کرتی تھی۔ لوط علیہ السلام اور ان کے چند گنے چنے ساتھیوں کے سوا کوئی ان کی بستی میں نہ تھا جو انھیں اس ذلیل حرکت پر ٹوکتا۔ اس بے حیائی پر وہ نہ صرف یہ کہ شرماتے نہ تھے بلکہ اجتماعی طور پر اپنے مجلسوں میں اس کے مزے لیتے تھے۔ اس بے حیائی پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ آج بھی ہالینڈ، بلجیم اور انگلستان جیسے 'مہذب' ملکوں میں اس قبیح فعل کو نہ صرف حلال کر دیا گیا ہے بلکہ بلجیم میں تو مردوں کے درمیان رشتۂ ازدواج کو بھی سندِ جواز عطا کر دی گئی ہے، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ انسانیت کی اس تذلیل اور گراوٹ پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ افسوس ہے ان بیوقوفوں پر جو ان جانوروں کو بلکہ جانوروں سے بدتر مخلوق کو (کیونکہ ان کو جانور کہنا بھی جانوروں کی توہین ہے) رشک آلود نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان کے اطوار وعادات کو اختیار کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

اس ذلیل مخلوق کو جب اس بےحیائی پر ٹوکا جاتا تو بجائے اس کے کہ کوئی ندامت وخجالت محسوس کرتی، الٹا ناصحین کو مطعون کرتی کہ پاکباز بنتے ہیں یعنی قابلِ ملامت کوئی شے تھی تو پاکبازی تھی یہ بےحیائی نہ تھی۔ اسی کو کہتے ہیں

"برعکس نام نہند زنگی کافور، اسی بات کو شاعر نے یوں کہا ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

لوطؑ کی نصیحتوں کا اس قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا، بس جہالت پر اتر آئی اور جبر وتشدد کے ذریعے نکالنے کی دھمکیاں دینے لگی اور بڑے چیلنج کے انداز میں کہا کہ لے آو! اللہ کے اُس عذاب کو جس کی دھمکیاں دیتے ہو۔

لوطؑ نے جب قوم کی یہ انتہائی باغیانہ روش دیکھی تو اپنے رب سے فریاد کی:

رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ۝ (العنکبوت: ۳۰)

"اے میرے ربّ، ان مفسد لوگوں کے مقابلے پر میری مدد کر"

ان کی اس ہی فریاد کا جواب یہ فرشتے لے کر آئے تھے۔ انھیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کیسے مدد کرتا ہے اور مجرموں کو کیسے پکڑتا ہے۔

مجرم قوم کی طرف

چنانچہ جب ابراہیمؑ کے سامنے فرشتوں نے 'مجرم قوم' کہا تو وہ فوراً ہی سمجھ گئے کہ یہ قومِ لوط کی طرف اشارہ ہے۔ اس قوم کی بدکاری و بدکرداری کا اتنا شہرہ ہو چکا تھا کہ "مجرم قوم" سے اس کے سوا کسی اور طرف ذہن منتقل ہی نہ ہو سکتا تھا؟

فرشتوں نے یہ بتانے کے بعد کہ کس قوم کی طرف آئے ہیں، اب یہ بھی بتایا کہ کس لئے آئے ہیں۔

فرشتوں کی آمد کا مقصد

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا إِنَّا مُهْلِكُو أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۖ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ ۝ (العنکبوت: ۳۱)

"اور جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر پہنچے تو انھوں نے کہا "ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے ہیں"

ابراہیمؑ اس وقت غالباً حبرون میں مقیم تھے جہاں سے یہ بستی صاف نظر آتی تھی، اس لئے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس بستی کو تباہ کریں گے اور تباہ اس لئے کریں گے کہ یہ لوگ ظالم

رویہ اختیار کر چکے ہیں اور اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہوگا کہ انسانی فطرت ہی مسخ کردی جائے۔
پھر اُس آنے والی تباہی کے انداز بتاتے ہوئے بولے۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝

(الذّٰریٰت: ۳۳، ۳۴)

" تاکہ اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسادیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لئے نشان زدہ ہیں۔"

ابراہیمؑ کی التجائے رحم

ابراہیمؑ اس خوفناک سزا کا ذکر سن کر لرز اٹھے۔ ان کی فطری رحمت و رافت نے جوش مارا اور جوش کیوں نہ مارتی جب کہ وہ گنہگاروں کے لئے اپنے رب سے التجا کرتے تھے۔

وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراھیم: ۳۶)

" اور جو کوئی میری نافرمانی کرے تو آپ تو بخشنے والے اور رحم فرمانے والے ہیں۔"

چنانچہ اس فطری رحمدلی کی بنا پر آپ اس بدبخت قوم کے لئے اللہ سے رحم طلب کرنے لگے۔ ارشاد ہوا:

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ (ھود: ۷۴، ۷۵)

" پھر جب ابراہیم کی گھبراہٹ دور ہوگئی اور (اولاد کی بشارت سے) اس کا دل خوش ہوگیا تو اُس نے قوم لوط کے معاملے میں ہم سے جھگڑا شروع کیا۔ حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔"

کوئی مخلوق خواہ کتنی ہی جلیل القدر کیوں نہ ہو، اللہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ کسی فرشتے یا انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ کسی معاملہ میں بھی خدا سے کوئی جھگڑا کر سکے اور خدا سے اپنی بات منوانے پر اڑ جائے اور اپنی بات منوالے۔ لیکن ابراہیمؑ کا معاملہ دوسرا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو "خلیل" کے لقب سے نوازا تھا۔ انھوں نے اپنی مسلسل قربانیوں اور کامل سپردگی کی بنا پر اللہ تعالیٰ سے "حنیفاً مسلماً" کا خطاب پایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قدم قدم پر حفاظت و نصرت

کی تھی۔ اپنے دشمن جان باپ کے لئے، اس کے مظالم وسنگدلانہ رویہ کے باوجود آپ نے اس وقت تک دعائے مغفرت کی جب تک کہ دو ٹوک الفاظ میں اُس سے منع نہ کر دیا گیا۔ آپ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ایک پوری قوم کی قوم اس عبرت ناک طریقے سے ختم کر دی جائے، چنانچہ آپ نے بار بار اپنے خدا سے التجا کی کہ اس 'مجرم قوم' کو معاف کر دیا جائے اور اُس پر آنے والا عذاب ٹال دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے فیصلے بڑے سوچے سمجھے، بے لاگ اور محکم ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر غفور رحیم کون ہو سکتا ہے۔ ماں کو اپنے شیر خوار بچے سے جو محبت ہوتی ہے اُس سے کون واقف نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے جو پیار ہے اُس سے ماں کی محبت کو بھی کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ جب ایسی شفیق و رحیم ذات کسی قوم کو عذاب دینے کا فیصلہ کرے تو وہ بڑا ہی علیم و حکیم ہے۔ بار بار کی التجاؤں اور گزارشوں کے باوجود جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اٹل رہا تو فرشتوں نے کہا:

عذاب کا اٹل فیصلہ

يَآاِبۡرٰهِيۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ ۚ

وَاِنَّهُمۡ اٰتِيۡهِمۡ عَذَابٌ غَيۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ○ (ھود: ۷۶)

"اے ابراہیم، اس سے باز آجاؤ، تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور اب لوگوں پر وہ عذاب آکر رہے گا جو کسی کے پھیرے پھر نہیں سکتا۔"

جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ اس قوم پر عذاب آکر ہی رہے گا تو انھوں نے کہا:

قَالَ اِنَّ فِيۡهَا لُوۡطًا ؕ (العنکبوت: ۳۲)

"انھوں نے کہا کہ اُس قوم میں تو لوط بھی موجود ہے۔"

یعنی اگر اس کی جاں بخشی نہیں ہوتی تو کم از کم لوطؑ کو تو بچا لیا جائے جو اسی قوم میں رہتے اور بستے ہیں۔ اگر اُس پوری قوم پر عذاب آیا تو لوط اور اُس کے اہل و عیال کیسے بچیں گے۔ فرشتوں نے جواب دیا۔

قَالُوۡا نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِيۡهَا (العنکبوت: ۳۲)

"انھوں نے کہا " ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے۔"

یعنی تمہارا کیا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بارے میں پوری پوری ہدایات نہیں دی ہیں اور ہمیں یہ نہ بتایا ہے کہ کسے بچانا اور کس کو مارنا ہے، ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہاں کون کون

موجود ہے اور کس کس کو باقی رکھنا ہے۔ پھر اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا:۔

لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝

(العنکبوت: ۳۲)

"ہم اسے اور اس کے باقی سب گھر والوں کو اس کی بیوی کے سوا بچالیں گے ،
اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی ۔"

یعنی ہم صرف لوطؑ ہی کو نہیں بچائیں گے بلکہ اُس سارے اہل وعیال کو بھی بچائیں گے سوائے اس کی بیوی کے کیونکہ وہ معذب قوم کے درمیان پیچھے رہ جائے گی ۔ دوسری جگہ فرشتوں کا جو جواب نقل کیا گیا ہے اُس سے کچھ مزید پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ۔ فرمایا:

اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝

(الحجر: ۵۹، ۶۰)

"صرف لوط کے گھر والے مستثنیٰ ہیں ، ان سب کو ہم بچالیں گے ، سوائے اس کی بیوی کے جس کے لئے (اللہ فرماتا ہے کہ) ہم نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی ۔"

اہل نبی کون؟

حضرت نوحؑ کے قصہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ نبی کے اہل صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو نبی پر ایمان لاتے ہیں ۔ نبی کا بیٹا بھی اگر نافرمان ہے اور صاحب ایمان نہیں تو وہ بھی اہل میں شامل نہیں ، وہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کا مصداق نہیں ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے کیا تھا کہ میں تمہیں اور تمہارے اہل کو نجات دوں گا ، چنانچہ نوحؑ کی آنکھوں کے سامنے ان کا بیٹا ڈبو دیا گیا ۔

یہاں بتایا گیا ہے کہ بیوی بھی 'اہل' میں شامل نہیں ہے اگر وہ صاحب ایمان اور نبی کی فرماں بردار نہیں ۔ نبی سے جو رشتہ قابل لحاظ ہے وہ صرف 'ایمان' کا رشتہ ہے نبی کا قریب سے قریب رشتہ دار بھی نبی کا اہل نہیں اگر وہ نبی پر ایمان نہیں رکھتا اور نبی کی اطاعت و فرمانبرداری نہیں کرتا ۔ یہی وہ بات ہے جو نبیؐ نے یوں فرمائی :

"اے صفیہ، رسول اللہ کی پھوپھی، اے فاطمہ اللہ کے رسول کی بیٹی، اپنی فکر کر لو،
میں تمہیں خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکوں گا۔"

اب وہ لوگ جو اپنے آپ کو آلِ نبی کہتے ہیں اور سوشلزم و کمیونزم جیسے ملحدانہ نظریات کو اپنائے ہوئے ہیں، خود اپنا مقام و انجام سوچ لیں۔

لوط علیہ السلام کے پاس فرشتوں کی آمد

ابراہیم علیہ السلام کو یہ اطمینان دلانے کے بعد کہ لوط ؑ اور اُن کے تمام اہل ایمان ساتھی اللہ کے مقرر کردہ عذاب سے بچا لئے جائیں گے، یہ فرشتے ابراہیم ؑ سے رخصت ہوئے اور قوم لوط کی طرف روانہ ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ ہے کہ جو قوم جس فتنے میں مبتلا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اُس ہی راہ سے اس کی آزمائش کرتا ہے۔ بابل کے لوگ جادوگری سیکھنے سکھانے میں مبتلا تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتے جادوگروں ہی کے بھیس میں بھیجے تاکہ ایک طرف ان لوگوں پر حجت تمام ہو جائے تو دوسری طرف وہ لوگ خود اپنے جال میں پھنسے۔

لوط ؑ کی قوم خوب صورت لڑکوں کی چاہت میں مبتلا تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو نہایت خوبصورت لڑکوں کی شکل میں اس قوم کی طرف بھیجا۔ یہ فرشتے ابراہیم ؑ سے رخصت ہو کر سیدھے لوط علیہ السلام کے گھر میں بحیثیت مہمان پہنچے۔ حسب سابق فرشتوں نے لوط ؑ کو اپنی شخصیت کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔

لوط علیہ السلام اللہ کے پیغامبر اور اس کے دین کے مبلغ تھے۔ اپنی بستی کے لوگوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان نئے چہروں کو دیکھ کر انھوں نے اندازہ لگایا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں جو باہر سے یہاں آگئے ہیں۔ ان کی اس کیفیت کا قرآن مجید میں یوں ذکر کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ نِ الْمُرْسَلُوْنَ ○ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ○ (الحجر: ۶۱، ۶۲)

"پھر جب یہ فرستادے لوط کے ہاں پہنچے تو اس نے کہا آپ لوگ اجنبی

معلوم ہوتے ہیں۔"

دوسری جگہ اس کی مزید تفصیل یوں بیان کی گئی ہے۔

مہمانوں کی آمد پر لوط علیہ السلام کی پریشانی

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝ (ھود: ۷۷)

"اور جب ہمارے فرشتے لوطؑ کے پاس پہنچے تو اُن کی آمد سے وہ بہت گھبرایا اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔"

تیسری جگہ بھی ان کا اس کیفیت کا ذکر ان ہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا (العنکبوت: ۳۳)

"اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی آمد سے وہ بہت گھبرایا اور دل تنگ ہوا۔"

لوط علیہ السلام کا یہ ردِ عمل فطری تھا۔ آپ اپنی قوم کی بدکرداری اور کجروی سے پوری طرح واقف تھے۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس بستی میں کوئی اجنبی آجائے تو بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس کا سامان، اس کے کپڑے، اس کی عزت، اس کی ہر چیز ہی لوٹ لیتے ہیں۔ یہ اجنبی لوگ اور وہ بھی خوب صورت، نوخیز لڑکے، بھیڑیوں کے غول میں معصوم میمنوں کی حیثیت رکھتے تھے جن کو پھاڑ کھانے کے لئے ان بھیڑیوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ پھر دوسری مشکل یہ کہ یہ سب لوطؑ کے یہاں آکر مہمان ٹھہرے۔ لوطؑ کو فکر ہوگئی کہ ان مہمانوں کو ان خونخوار بھیڑیوں سے کیسے بچاؤں گا۔ اسی لئے مہمانوں کے آنے سے خوش ہونے کی بجائے دل تنگ ہوئے اور بہت گھبرائے۔ اسی گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا۔

هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ "آج کا دن بہت سخت ہے۔ بڑی مصیبت کا دن ہے۔"

انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ حسین و جمیل لڑکے ان (لوطؑ) کے نجات دہندہ اور ان بدمعاشوں کے لئے پیغام اجل بن کر آئے ہیں۔ لوطؑ ابھی اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ بستی کے اوباشوں

کو خبر پہنچ گئی کہ لوطؑ کے یہاں اجنبی حسین وجمیل لڑکے بطور مہمان آئے ہیں۔ اگر ان میں شرافت کی رمق بھی باقی ہوتی تو ان کو مہمان سمجھ کر اگر خاطر مدارات نہ کرتے تو کم از کم ان سے تعرض تو نہ کرتے، لیکن وہاں تو شرافت نامی شئے ناپید ہو چکی تھی۔ انھوں نے جب سنا تو منہ میں پانی بھر آیا۔ سوچا کہ نیا شکار آیا ہے چلو دبوچیں، بس پھر کیا تھا :

اوباشوں کی چڑھائی

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ

"(ان مہمانوں کا آنا تھا کہ) اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔" (ھود : ۷۸)

اور یہ کیسے دوڑے ؟ فرمایا۔

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (الحجر: ۶۷)

" اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بیتاب ہو کر لوط کے گھر چڑھ آئے۔"

ایک دوسرے کو بشارت دیتے آئے کہ ایسا " مال " کبھی ہاتھ نہ لگے گا۔ آؤ جھولیاں بھرلو، اور دل بھر کے اپنی ہوس کے پیالے پُر کرلو۔ بستی کے اوباشوں کے یہ ٹولے چاروں طرف سے اُمڈ اُمڈ کر آئے اور لوط ؑ کے مکان کا گھراؤ کر لیا۔ ان گھراؤ کرنے والے بدمعاشوں کی ہمیشہ سے یہ ذہنیت رہی ہے۔ کہ بدمعاشی پر اکٹھے ہوتے ہیں اور ہر شریف آدمی کو اپنے زور سے دبانے کے لئے ایسے مطالبات پیش کرتے ہیں جنھیں پورا کرنا اس کے بس میں ہی نہیں ہوتا؟ چنانچہ انھوں نے بھی لوط علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ یہ لڑکے ہمارے حوالے کر دئیے جائیں۔ ان کی بدمعاشی کا اس ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب یہ لوطؑ جیسے شریف النفس اور باحیا معلم اخلاق اور خدا کے نبی کے ساتھ اُن کا یہ معاملہ تھا تو دوسرا کون تھا جسے بخش دیتے۔ کون تھا اس بستی میں جو ان کی دست برد سے محفوظ رہا ہوگا ؟

ایک طرف لوطؑ تن تنہا تھے اور دوسری طرف اوباشوں کا یہ جم غفیر۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ان کے مطالبوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا یا راہِ فرار اختیار کرتا لیکن لوط علیہ السلام تو اللہ کے نبی تھے۔ جن کا مشن ہی بدی وظلم کا مقابلہ کرنا تھا اور صرف اللہ کی مدد کے بھروسے پر ساری دنیا سے

مقابلہ کرنا تھا۔ لوط ع نے آخر وقت تک ان اوباشوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کے سروں پر جو بھوت سوار تھا وہ نصیحتوں سے کب باز آنے والا تھا۔ جس نشے میں یہ مبتلا تھے وہ تو بو تے کھا کر ہی اترتا۔ جب یہ اوباش اپنی ضد پر اڑے ہی رہے تو لوط ع نے انھیں غیرت دلائی اور کہا۔

لوط علیہ السلام کی فہمائش

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝

(الحجر: ۶۸، ۶۹)

" لوط نے کہا، بھائیو، یہ میرے مہمان ہیں، میری فضیحت نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔ "

لیکن اُن میں غیرت و شرافت تھی کہاں جو مانتے۔ نہایت ڈھٹائی سے کہنے لگے:

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الحجر: ۷۰)

" بولے کیا ہم بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکیدار نہ بنو۔ "

جب لوط ع کی یہ نصیحت بھی کارگر نہ ہوئی اور خدا کا واسطہ بھی انھیں اس ارادہ بد سے باز نہ رکھ سکا تو تنگ آکر انھوں نے کہا:

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ (الحجر: ۷۱)

" لوط نے عاجز ہو کر کہا، اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں۔ "

دوسری جگہ یہ جواب اس پیرایہ میں بیان ہوا ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ
لَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ (هود: ۷۸)

" لوط نے کہا، بھائیو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لئے پاکیزہ تر ہیں، کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں۔ "

لوط ع نے ان کے مردہ ضمیروں کو جھنجھوڑنے کی آخری کوشش کی اور اپنے مہمانوں کو بچانے کے لئے اپنی عزیز ترین شے ان کے سامنے پیش کردی اور انھیں پاکیزہ راستہ دکھانے کی

پوری سعی کی لیکن یہ پاکیزہ نصیحتیں توان کے لئے گوبر کے کیڑے کو شہد دینے کے مترادف تھیں۔ لوطؑ توانھیں بتا رہے تھے کہ مردوں کے لئے اللہ نے عورتوں کو پیدا کیا ہے۔ اگر تمہاری خواہشات اتنی ہی بے قابو ہیں توان کی تسکین کے لئے پاکیزہ راستہ اختیار کرو۔ میری یا میری قوم کی بیٹیاں موجود ہیں، اُن سے نکاح کرو اور اس بے حیائی کے راستے سے باز آجاؤ۔ لیکن جو طبیعتیں گندگی کی خوگر ہوں انھیں پاکیزگی کیسے بھاتی۔ ان کی تو زندگی ہی گندگی میں بسر ہوئی تھی اب وہ کیسے پاکیزگی اختیار کر لیتے۔ ان میں کوئی بھلا آدمی ہوتا تو بھلی بات کی قدر کرتا۔ وہاں تو بھلائی نام کی کوئی شئے قسم کھانے کے لئے بھی موجود نہ تھی۔ لوطؑ کی اس پاکیزہ بیانی کے مقابلہ میں نہایت بے حیائی سے جواب دیا۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ○ (ھود:۷۹)

"بولے، تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟"

اُن کی اوباشی نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا، ان کی عقلوں پر پردے ڈال دئے تھے۔ ان کے کان نصیحت کے لئے بہرے ہو گئے تھے۔ اب اُن پر کوئی نصیحت کارگر نہ ہو سکتی تھی۔ اُن کی اس گراوٹ کا نقشہ قرآن حمید نے ان جامع الفاظ میں کھینچا ہے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ○ (الحجر: ۷۲)

"تیری جان کی قسم، یہ لوگ اپنی بدمستی میں اندھے ہو رہے تھے۔"

لوطؑ کی ہمت اب جواب دینے لگی تھی۔ ان غنڈوں اور بدمعاشوں کا اتنی دیر سے تن تنہا مقابلہ کر رہے تھے۔ انھیں سمجھانے اور باز رکھنے کے لئے جتنی تدبیریں ہو سکتی تھیں، اختیار کر چکے تھے۔ لیکن سب بے سود ثابت ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ اوباش بزور بازو اپنے ارادوں کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ لوطؑ نے جب یہ حالت دیکھی تو نہایت کرب و پریشانی کے عالم میں فریاد کی۔

لوط علیہ السلام کی فریاد

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ○ (ھود: ۸۰)

"لوط نے کہا، کاش میرے پاس اتنی قوت ہوتی کہ تمہیں سیدھا کر دیتا یا کوئی

مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ اس کی پناہ لیتا ۔

یہ فقرے حضرت لوط ؑ کی بے بسی اور یاس کی مکمل تصویر ہیں۔ ان الفاظ میں ایک غیرتمند لیکن مجبور انسان کی کرب و فریاد پوری طرح سنائی دیتی ہے۔ اب ممکن نہ تھا کہ یہ فریاد رائیگاں جاتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک حد تک ہی آزماتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اب معاملہ حد سے گزرنے والا ہے تو اپنے فریادی کی دست گیری فرماتا ہے ۔

فرشتوں کا اظہار حقیقت

فرشتے اب تک یہ سارا معاملہ خاموشی سے دیکھ رہے تھے، ابھی تک مصلحت نے ان کو اظہار حقیقت سے روکے رکھا تھا اب جب کہ دن ڈھل چکا تھا اور رات سر پر آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت لوط علیہ السلام کی قوت مزاحمت بھی جواب دینے لگی تھی اور ان کی تذکیر و نصیحت اب فریاد و فغاں میں تبدیل ہونے لگی تھی، تو انھوں نے مناسب سمجھا کہ لوط ؑ کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا جائے اور اب وہ اس بدانجام قوم کو سمجھانے اور بچانے کی بجائے اپنی اور اپنے ایمان ساتھیوں کو بچانے کا بندوبست کریں، چنانچہ انھوں نے کہا :

قبولیت فریاد ــــــ وعدۂ عذاب

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ
مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا
مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ (ہود: ۸۱)

فرشتوں نے کہا، اے لوط، ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، یہ لوگ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ بس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل جا اور دیکھو! تم میں سے کوئی شخص پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ مگر تیری بیوی (ساتھ نہیں جائے گی) کیونکہ اس پر بھی وہی کچھ گزرنے والا ہے جو ان لوگوں پر گزرنا ہے ۔ ان کی تباہی کے لئے صبح کا وقت مقرر ہے۔ صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے۔"

دوسری جگہ اس گفتگو کی تفصیل یوں آئی ہے :

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ○ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ○ (الحجر: ۶۳-۶۶)

"انھوں نے جواب دیا "نہیں، بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کر رہے تھے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں لہٰذا اب تم کچھ رات اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود اُن کے پیچھے پیچھے چلو۔ تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے۔ پس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا حکم دیا جا رہا ہے" اور اُسے ہم نے اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے اِن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی"

یہ اُس چیلنج کا جواب تھا جو اس نافرمان قوم نے لوطؑ کو دیا تھا کہ "لے آؤ اللہ کا وہ عذاب جس کی تم دھمکیاں دے رہے ہو، اگر تم سچے ہو۔"

واقعی اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔ جب وہ پکڑتا ہے تو سارے گھر نیند کر دیتا ہے۔ کاش آج بھی اللہ کو چیلنج دینے والے مجرمین سمجھ لیں کہ ان کا چیلنج کبھی خالی نہیں چھوڑا جاتا۔ اور جب اس چیلنج کا جواب دیا جاتا ہے تو پھر اُن کا کوئی نام لیوا تک باقی نہیں رہتا۔

اُس وقت لوط علیہ السلام کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف غنڈے اور اوباش مکان کو چاروں طرف گھیرے ہوئے تھے، دوسری طرف انھیں اپنی اور اپنے مہمانوں کو بچانے کی فکر تھی، سب اوباش اب مائل بہ تشدد تھے اور اپنے مقصد کو بزور بازو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف بدقماش لوگوں کا غضبناک جم غفیر جو ہر قیمت پر اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کرنا چاہتا تھا، تو دوسری طرف لوطؑ تن تنہا۔ عجیب کشمکش اور پریشانی کا عالم ہوگا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کریں تو کیا کریں اتنی قوت نہیں کہ بدمعاشوں سے نمٹیں سمجھانا بجھانا بے اثر ثابت ہوا، کب تک ان کا مقابلہ کر سکیں گے۔ ایسی پُرخطر اور تشویشناک صورت میں جب فرشتوں نے اصلی حقیقت بتائی ہوگی اور اللہ کا فیصلہ سنایا ہوگا تو آپ کی جان میں جان آئی ہوگی اور اطمینان کا

سالس لیا ہوگا ۔

پھر فرشتوں نے صرف اتنا ہی نہیں بتایا کہ یہ لوگ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے اور اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہ ہوسکیں گے بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اس بدبخت قوم کی تباہی کے لیے کون سا وقت مقرر کیا گیا ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اللہ کے وعدے کا مصداق صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ کے فرماں بردار اور اہل ایمان ہیں اور آپ کی بیوی ان لوگوں میں سے نہیں ۔

پھر آپ دیکھیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے تو کیسے کرتا ہے اور کس حد تک کرتا ہے ۔ لوطؑ کو صرف اتنا ہی نہ بتایا کہ ان مجرموں کو سزا دی جائے گی بلکہ انھیں یہ بھی بتایا کہ اس وقت روانہ ہوں، اس طرف جائیں اور اس طرف نہ جائیں اور اس طریقے سے جائیں کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھیں گویا بچے کی راہ پر انگلی پکڑ کر چلا دیا ۔

چند اہم نکات

یہاں پر چند اہم باتیں قابل غور اور توجہ طلب ہیں :

۱ ۔ باوجودیکہ لوطؑ اللہ کے نبی تھے لیکن انھیں آخر وقت تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کے مہمان فرشتے ہیں ۔ یہ حقیقت انھیں جب ہی معلوم ہوئی جب فرشتوں نے انھیں خود ہی آگاہ کیا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیب کا حال اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ۔ فرشتے ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، لیکن وہ آخر وقت تک اس حقیقت سے بے خبر رہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کا علم دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو بہت سے امور غیب کی پہلے سے اطلاع دے دیتا ہے لیکن جن امور کی اطلاع نہیں دیتا اس کے بارے میں وہ بھی اتنے ہی لاعلم ہوتے ہیں جتنے کہ دوسرے انسان ۔

۲ ۔ لوطؑ نے اپنے کانوں سے اپنی بیوی کا انجام سن لیا لیکن اس کے بارے میں آپ نے ایک لفظ تک نہ کہا ۔ شاید یہ خاموشی اس وجہ سے ہو کہ آپ اپنی بیوی کے میلانات و رجحانات سے پوری طرح واقف تھے ۔ جب اس بارے میں اللہ کا فیصلہ سنا تو آپ نے اس کے اعمال کا یہ فطری نتیجہ سمجھا اور راضی برضا ہونے کی بے مثال نظیر قائم کی ۔

۳ ۔ اللہ کے ہاں کسی کا حسب و نسب کام آسکتا تو سب سے پہلے نوحؑ کا بیٹا اور ابراہیمؑ

کے باپ اور لوطؑ کی بیوی کے کام آتا کہ اس سے زیادہ قریبی رشتہ کوئی دوسرا نہیں۔

فرشتے لوطؑ کو صرف اتنا ہی بتا کر رہ نہ گئے کہ ہم فرشتے ہیں اور یہ بدکردار قوم صبح کے وقت تباہ و برباد ہوگی اور یہ تمہاری بیوی بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ ہلاک ہو جائے گی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ ان کی تباہی کا انداز کیا ہوگا۔

عذابِ الٰہی کا انداز

وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ إِنَّا مُنَجُّوكَ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ۝ إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ (العنکبوت ۳۳، ۳۴)

"اور انھوں نے کہا، نہ ڈرو اور نہ رنج کرو، ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچا لیں گے سوائے تمہاری بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ ہم اس بستی کے لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اُس فسق کی بدولت جو یہ کرتے رہے ہیں۔"

اس آسمانی عذاب کی تفصیل صبح کو ظاہر ہوئی جب یہ قوم نیست و نابود کر کے رکھ دی گئی۔

لوطؑ کو چند احتیاطی تدابیر کی تاکید

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو حسب ذیل احتیاطی تدابیر بھی بتائیں:

۱۔ وہ رات کے ایک حصہ میں اس بستی کو چپکے سے چھوڑ چلے جائیں، تا کہ اُس عذاب کی لپیٹ سے دور رہیں جو صبح کو اس بدنصیب قوم پر آنے والا تھا۔

۲۔ جانے والوں میں سے کوئی شخص پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے کہ مبادا وہ اُس دہشت ناک منظر کی وجہ سے ٹھٹک کر رہ جائے اور معذّب علاقے میں گھر کر عذاب کا نشانہ نہ بن جائے۔

۳۔ چپکے سے نکلنے کی تاکید اس لئے کہ ان کا گھیراؤ کرنے والوں کو اصل معاملہ کی کوئی سن گن بھی نہ مل سکے اور وہ اچانک پکڑے جائیں۔ اگر ان کے نکلنے کی ان کو ذرا بھی آہٹ مل جاتی تو یا تو وہ جو کنے ہو جاتے اور لوطؑ کی راہ روکنے کی کوشش کر کے ان کی پریشانیوں کا سبب بنتے یا آنے

والے عذاب کی کوئی سن گن بھی مل جاتی تو فرار ہونے کی کوشش کرتے۔ بہرحال لوط ؑ نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے سب اہل ایمان ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور ان اوباشوں کے نرغے میں سے صاف نکل گئے۔

فراستِ مومن

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ

"مومن کی فراست سے ڈرو۔"

واقعی مومن کی فراست ہے ہی ایسی چیز کہ اُس سے ڈرا جائے۔ وہ اللہ کے بخشے ہوئے نورِ ہدایت سے ایسی راہیں تلاش کرلیتا ہے جہاں دوسروں کی نظریں پہنچ ہی نہیں سکتیں۔

فراست مومن کا ایک مظاہرہ لوط علیہ السلام نے کیا کہ اہل و عیال سمیت راتوں رات دشمنوں کے نرغے سے نکل گئے اور انھیں خبر بھی نہ ہوئی۔

فراست مومن کا ایک اور مظاہرہ اس وقت ہوا تھا جب موسیٰ علیہ السلام ارشادِ ربانی کی تعمیل میں اپنی پوری قوم کے ساتھ فرعون کے لشکروں کے سامنے سے نکل گئے اور اُس کا سارا جاسوسی انتظام دھرے کا دھرا رہ گیا۔

فراستِ مومن کا ایک مظاہرہ اس وقت ہوا جب بیعتِ عقبہ اولیٰ و ثانیہ منعقد ہوئی اور کفارِ مکہ کی ساری کوششوں کے باوجود اُن کی بھنک بھی ان کے کانوں میں نہ پڑی۔

اس کا ایک اور مظاہرہ اس وقت ہوا جب حضور پاک ؐ ہجرت کی رات کفار کے مسلح پہرہ کے باوجود ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر صاف نکل گئے اور انھیں صبح ہی پتہ چلا کہ ان کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔

یہ کامل رازداری اور انتہائی خفیہ تدبیریں صرف فراست مومن ہی انجام دے سکتی ہے کہ دشمن کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو اور کام بھی تکمیل پا جائے۔ افسوس ہے کہ آج ہم اس فراست سے بالکل تہی دامن ہو گئے ہیں اور اب ہمارا کوئی ایسا راز نہیں جو وقت سے پہلے ظاہر نہ ہو جائے۔

قرآن مجید نے اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا

غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (الذّٰریٰت: ۳۵،۳۶)

"پھر ہم نے اُن سب لوگوں کو نکال لیا جو اُس بستی میں مومن تھے، اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔"

یہ تھی وہ کل کائنات جسے لے کر لوطؑ نکلے تھے۔ اس بھرے پُرے علاقے میں صرف ایک گھر اور وہ بھی لوطؑ کا گھر تھا جس میں اہل ایمان آباد تھے اور پورا علاقہ کفرزار بنا ہوا تھا۔ کفرزار بھی کیسا کہ جس کا بچہ بچہ بدقماش اور بداطوار تھا۔ پوری بستی کی آنکھوں کے سامنے بے حیائی کا ننگا ناچ ناچتی رہی، بستی کا بہترین انسان اپنی اور اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لئے اخلاق و شرافت کی دہائی دیتا رہا، لیکن اس پوری بستی میں سے ایک انسان بھی ایسا نہ نکلا جو اس معلم اخلاق، مربی انسانیت کی حمایت میں ایک لفظ بھی کہتا۔ جس بستی میں ظلم و بدکاری اس درجہ عام ہو جائے اس پر اگر اللہ کا عذاب نہ آئے گا۔ تو کیا پھول برسائے جائیں گے؟ چنانچہ اس کا جو حشر ہونا چاہیے تھا وہ ہوا:

تباہی ہی تباہی

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝ (ھود: ۸۲،۸۳)

"پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اُس بستی کو تلپٹ کر دیا اور اُس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا۔ اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست زلزلہ آیا جس نے اُس بستی کو زیروزبر کر دیا اور آتش فشاں پہاڑ نے پھٹ کر آگ اور پتھروں کی ایسی بارش کر دی جس سے اُس مجرم قوم کا ایک فرد بھی نہ بچ سکا۔ ہر پتھر نے وہ کام کیا جو اللہ نے اُس کے لئے مقرر کر دیا تھا اور ہر ظالم کو پیس کر رکھ دیا۔

ہر ظالم جب کہ اس کے پاس طاقت بھی ہو —— اور طاقت ور ہی ظالم ہوتا ہے، کمزور بیچارا کیا ظلم کرے گا، وہ تو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا —— ہمیشہ یہ سمجھتا ہے کہ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا

اسے اپنی طاقت اور لشکروں پر، اپنے مصاحبوں اور جتھے پر، اپنی فراست اور چالوں پر اتنا گھمنڈ ہوتا ہے کہ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کوئی اس کا بال بھی بیکا کر سکے گا۔ اپنی اسی طاقت کے نشے میں ہر زبردست کو دباتا ہے، ہر حد کو پھاندتا ہے اور ہر بندش کو توڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ بالکل محفوظ و مامون ہے۔ لیکن اُسے معلوم نہیں کہ یہاں ہر کمزور کا ایک حامی، ہر مظلوم کا ایک دادرس اور ہر پکارنے والے کا ایک مددگار رہے اور وہ اللہ ہے۔ وہ ایک طویل عرصے تک ظالموں کی رسی دراز کرتا رہتا ہے، لیکن جب اس کی پکڑ آتی ہے تو زمین و آسمان میں کوئی طاقت نہیں جو اس کی پکڑ سے بچا سکے۔ قومِ لوطؑ کے لوگ بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ جو چاہیں کرتے پھریں کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، لیکن اللہ کے ایک اشارے ہی نے ان کی ساری ہیکڑی نکال دی اور اُن کی وہ درگت بنی کہ رہتی دنیا تک ان کے انجام سے لوگ کان پکڑیں گے۔ ان کے اس انجام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں اطلاع دی:

فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَ ۝ فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۝ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِيۡنَ ۝ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ ۝ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ (الحجر: ۷۳-۷۷)

"آخر کار پو پھٹتے ہی اُن کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا اور ہم نے ان کی بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور اُن پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی۔ اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو صاحبِ فراست ہیں اور وہ علاقہ (جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا) گزرگاہِ عام پر واقع ہے، اُس میں سامانِ عبرت ہے اُن لوگوں کے لئے جو صاحبِ ایمان ہیں۔"

دیکھئے اللہ کا وعدہ کس طرح پورا ہوا۔ فرشتوں نے بتایا تھا کہ اس مجرم قوم کے انجام کے لئے صبح کا وقت مقرر کیا گیا اور صبح تو کچھ دور نہیں اور واقعی صبح کچھ دور نہ تھی۔ اُس بدنصیب قوم کے لئے وہی صبح شامِ غم بن گئی اور پھر اُسے دوسری صبح دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ صبح ہوتے ہی ایک زبردست زلزلہ آیا اور انھیں اٹھا کر پٹخ دیا۔ اوپر سے آتش فشاں پہاڑ نے پھٹ کر رہی سہی کسر پوری کر دی۔ آگ اور پتھروں کا ایک جہنم تھا۔ جو اُس بدبخت قوم پر الٹ پڑا اور فرشتوں کا کہا سچ ثابت ہوا کہ ہمارے پاس مجرموں کے لئے نشان زدہ پتھر ہیں اور واقعی ہر پتھر اپنے نشانہ پر لگ کر رہا۔

ابھی تو اللہ کی سزا پوری نہیں ہوئی تھی۔ آخرت میں تو اللہ تعالیٰ جو کچھ سزا دے گا وہ دے گا ہی، دنیا میں بھی ایسی سزا دی کہ پناہ بخدا۔ زمین دھنسی اور بحیرہ لوط (جو آج کل بحیرۂ مردار کہلاتا ہے) کا پانی چڑھ دوڑا اور ان بستیوں کو غرق کر دیا۔ خدا کے عذاب کی کون سی شکل ایسی تھی جو اس بدبخت قوم پر وارد نہ ہوئی۔ آج بھی یہ بستیاں بحیرۂ مردار کے جنوب مشرقی علاقہ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں اور نشانِ عبرت بنی ہوئی ہیں۔

یہ بستیاں اس شاہراہ پر واقع ہیں جو عراق سے مصر جاتے ہوئے اور حجاز سے شام جاتے ہوئے گزرتی ہیں، جن کے متعلق قرآن مجید نے بتایا:

وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ○ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

(الصّٰفّٰت: ۱۳۷، ۱۳۸)

"آج تم شب و روز اُن کے اجڑے ہوئے دیار پر سے گزرتے ہو۔ کیا تم کو عقل نہیں آتی؟"

یہ کفارِ قریش سے ایک چبھتا ہوا سوال تھا، لیکن انھیں عقل آتی کہاں سے؟ ان واقعات سے نصیحت تو ایمان والے ہی حاصل کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہوں اور حق کو ہنسی ٹھٹھوں میں اڑا دیتے ہوں، ان کے لئے تو بڑے سے بڑا واقعہ بھی گردشِ روزگار ہے، ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان عبرت ناک واقعات کو بار بار دیکھتے اور اپنی باغیانہ روش پر قائم رہتے۔

اصل نبی کی نجات

یہ تو اللہ کے وعدے کی صرف ایک شق تھی جو پوری ہوئی۔ رہی دوسری شق کہ "ہم لوطؑ اور اُس کے اہل و عیال کو بچا لیں گے" اُس کے متعلق فرمایا:

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڮ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ○

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ○

(الاعراف: ۸۳، ۸۴)

"آخر کار ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو ـــــ بجز اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی ـ بچا کر نکال دیا اور اُس قوم پر برسائی ایک بارش، پھر دیکھو کہ اُن مجرموں کا کیا انجام ہوا۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوا ؛

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ (النمل: ۵۷، ۵۸)

" آخر کار ہم نے بچا لیا اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو، بجز اُس کی بیوی کے جس کا پیچھے رہ جانا ہم نے طے کر دیا تھا، اور برسائی اُن لوگوں پر ایک بارش، بہت ہی بُری بارش تھی وہ اُن لوگوں کے حق میں جو متنبہ کئے جا چکے تھے ۔ "

یوں اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ ایک ہی رات منکرین حق کے لئے وعدۂ عذاب بن کر آئی اور حاملین حق کے لئے سامان نجات بن کر آئی ۔ اُس رات میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی عذاب بھری بارش بھیجی جس نے اُس مجرم قوم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا ۔

یہ بارش کیسی تھی، اس کا ذکر پچھلی آیات میں کیا جا چکا ہے ۔ یہ بارش پتھروں کی، آگ کی، لاوے کی تھی جس نے ایک لمحہ میں ان مجرم بستیوں کو فنا کر دیا اور ہمیشہ کے لئے اُن کا قصّہ پاک کر دیا ۔

اس پورے واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے چند مختصر فقروں میں یوں سمیٹ دیا ۔

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۝ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت: ۱۳۳-۱۳۸)

" اور لوطؑ بھی اُنہی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں ۔ یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اُس کے سب گھر والوں کو نجات دی، سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی ۔ پھر باقی سب کو تہس نہس کر دیا ۔ آج تم شب و روز اُن کے اجڑے دیار پر سے گزرتے ہو کیا تم کو عقل نہیں آتی ۔ "

دوسرے مقام پر اہل حق اور مخالفین حق، فرمانبرداروں اور نافرمانوں کی اس داستان کشمکش کو چند جملوں میں بیان کر کے فرماں برداروں کے انجام بخیر کا یوں ذکر فرمایا :

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰۗىِٕثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ

اِنَّہٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (الانبیآء: ۷۴، ۷۵)

"اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اُسے اُس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی ـــــ درحقیقت وہ بڑی ہی بُری فاسق قوم تھی ـــــ اور لوطؑ کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ صالح لوگوں میں سے تھا۔"

حضرت لوط علیہ السلام بظاہر کمزور اور تنہا تھے اور اُن کے مقابل ایک پوری شریر اور بدکار قوم تھی وہ سمجھتے تھے کہ ہم لوطؑ کو دبالیں گے۔ لوطؑ آخر وقت تک ان شامت کے ماروں کو سمجھاتے رہے، اور انبیاء علیہم السلام اور مصلحین کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ انجام اور مخالفین کی کثرتِ تعداد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا کام کئے جاتے ہیں ـــــ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ بالآخر کون کامیاب ہوا اور کون خائب و خاسر۔ اللہ تعالیٰ نے لوطؑ اور اُن کے ساتھیوں کو نہ صرف بچا لیا بلکہ انھیں اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دی اور لوطؑ کو صالح لوگوں کے زمرہ میں داخل کیا جن پر تا قیامت سلام و رحمت کی بارش ہوتی رہے گی۔

اہلِ ایمان کے لئے سامانِ عبرت

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۳۵)

"اور ہم نے اُس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑدی ہے اُن لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

آج کوئی زبان نہیں جو ان کی تباہی پر ماتم کناں ہو، کوئی آنکھ نہیں جو ان کی بربادی پر روتی ہو ـــــ بلکہ اس کے برعکس ان کی بستیوں کو ایسا تباہ و برباد کرکے رکھ دیا کہ جو کوئی بھی ان کھنڈرات کو دیکھتا ہے، اُن سے عبرت حاصل کرتا ہے اور کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ اُن کے کرتوتوں پر لعنت ہی بھیجتا ہے۔

یہ اللہ کی سنت ہے۔ اس سنت کا دوسرے مقامات پر یوں ذکر کیا ہے:

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ فَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝ (الحج: ۴۵)

"اور کتنی ہی خطاکار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں، کتنے ہی کنویں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔"

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۴۰)

"آخر کار ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑا، پھر اُن میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا، اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔"

کاش آج جو لوگ خدا کی زمین میں دن رات فسق و فجور پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں، ان نشاناتِ عبرت سے سبق حاصل کرتے اور اُس کی بغاوت کو چھوڑ کر اطاعت و فرمانبرداری کی راہ اختیار کرتے، لیکن افسوس ہے کہ اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝

(الحج: ۴۶)

"کیونکہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں چھپے ہوئے ہیں۔"

اولادِ ابراہیمؑ

لوطؑ کے ہاں جانے سے پہلے فرشتے جب ابراہیمؑ کے پاس پہنچے تھے تو انھوں نے آپ کی اہلیہ حضرت سارہ کو جو خوش خبری سنائی تھی وہ یہ تھی :

اسحاقؑ و یعقوبؑ

فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ○ (ھود: ۷۱)

" پھر ہم نے اس کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی ۔"

فرشتے تو خوش خبری دے کر اپنے مشن پر لوطؑ کی طرف چلے گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس خوشخبری کو یوں عملی جامہ پہنایا :

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ○ (الانبیآء : ۷۲)

" اور ہم نے اسے اسحاق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید، اور ہر ایک کو صالح بنایا ۔"

اس خوش خبری کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اسحاقؑ جیسا صاحب علم بیٹا عطا کیا اور اس پر مزید فضل یہ کیا کہ حضرت اسحاقؑ کو یعقوبؑ جیسا بیٹا عطا فرمایا اور ان سب کو صالح بنایا ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے دونوں حضرات کو صرف نعمتِ اولاد ہی سے نہ نوازا بلکہ اولاد کو صالح بھی بنایا ۔

اولاد بذات خود ایک نعمت ہے لیکن اگر یہ اولاد نیک نہ ہو تو یہ نعمت مصیبت میں تبدیل ہو جاتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تکمیلِ نعمت کے لئے اولاد کو نیک بھی بنایا اور جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے، اولاد کو صرف صالح ہی نہیں بنایا، بلکہ صالحیت کا اعلیٰ ترین درجہ نبوت بھی عطا کیا : اور ان کی اولاد کو برکت عطا کی ۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا :

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ۝ (الصّٰفّٰت: ۱۱۳)

"اور اُسے اور اسحاق کو برکت دی۔ اب ان دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے۔"

یہ برکت کوئی اندھی بانٹ نہ تھی کہ جو کوئی بھی حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے پیدا ہو گیا وہ مبارک ہی ہوا۔ نہیں، یہ برکت اُس ہی اولاد کے حصہ میں آئی جو محسن تھی جس نے ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے راستے کو اپنایا اور ان کے نقشِ قدم پر چلی۔ رہی وہ اولاد، جس نے اُن کے راستے سے روگردانی کی وہ ظالموں میں شمار ہوئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بے لاگ انصاف ہے جو ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کو جو برکت عطا فرمائی، اس کی تفصیل یوں فرمایا!

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

(العنکبوت: ۲۷)

"اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب (جیسے فرزند) عطا کیے، اور اُس کی نسل میں ہم نے نبوت اور کتاب رکھ دی اور اُس کو دنیا میں اس کا اجر عطا کیا اور وہ آخرت میں بھی یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔"

یہ محسن اور صالح کن خصوصیات کے حامل اور کن خوبیوں کی بنا پر دنیا میں امام قرار دیے گئے، اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی۔

ائمہ ہدیٰ ——— خصوصیات

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۷۳)

"اور ہم نے اُن کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعے نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ

ہمارے عبادت گزار تھے ۔"

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو علم وحی سے نوازا۔ اسی وحی کے ذریعے انھیں نیک کاموں کی تفصیل بتائی گئی اور اُن پر چلنے کی ہدایت کی گئی۔ کھرے اور کھوٹے کی تمیز دی گئی، نیکی اور بدی کی پہچان دی گئی، ہدایت اور ضلالت کا فرق بتایا گیا۔ وہ زندگی کے ہر مرحلہ اور موڑ پر حق و باطل کو پہچان سکتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو صرف یہ پہچان و تمیز ہی نہ دی، بلکہ اس ہدایت پر عمل کرنے کا حکم بھی دیا۔ ان حضرات کا کام صرف نیک کاموں کی فہرست تیار کرنا یا گنوانا ہی نہ تھا بلکہ خود اُن پر چل کر دکھا دینا تھا۔

۲۔ دوسرا کام جس پر یہ حضرات مامور تھے وہ تھا اقامت صلوٰۃ۔ یعنی نماز خود پڑھنا، دوسروں کو نماز سکھانا اور پڑھوانا، نماز کا نظام قائم کرنا، اس کے لئے سازگار ماحول و فضا پیدا کرنا اور اس کے مقررہ قاعدوں کے مطابق اس کے لئے عبادت گاہیں قائم کرنا۔

۳۔ تیسرا کام جو ان حضرات کے سپرد تھا وہ ادائیگی زکوٰۃ کا بندوبست کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جو مال خود انھیں دیا یا ان کے ماننے والوں کو یا ان کے زیراثر و زیرنگیں افراد کو دیا، اُن سے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق مال وصول کرنا اور خدائی ہدایات کے مطابق ان کو خرچ کرنا اور اس کا ایسا نظام قائم کرنا کہ ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔

یہ وہ تین اہم امور ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کے سپرد کئے تھے۔ اسی کام پر اللہ تعالیٰ نے انھیں مامور کیا اور ائمہ ہدایت بنایا کہ خلق خدا کو راہِ ہدایت دکھائیں اور آگے بڑھ کر خود ان کی رہنمائی کریں، عملی طور پر بھی اور علمی طور پر بھی۔ اب جو لوگ ان کی ذریت اور اولاد میں شامل ہیں، وہ اگر ان امور کو انجام دیتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، یعنی راہ ہدایت کی رہنمائی، اقامت صلوٰۃ اور ادائیگی زکوٰۃ کا نظام قائم کرنا، تب تو وہ ان کی ذریت میں شامل ہونے کے قابل ہیں ورنہ نہیں۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقامات پر یوں واضح فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (الحدید: ۲۶)

"اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور اُن دونوں کی نسل میں نبوت رکھ دی، پھر

ان کی اولاد میں سے کسی نے ہدایت اختیار کی اور بہت سے فاسق ہو گئے۔"

صرف نسلی تعلق ہدایت کے لیئے کافی نہیں

یعنی نوح ع و ابراہیم ع کی نسل سے تعلق رکھنے کے لازماً یہ معنی نہیں کہ وہ سب ہدایت یا فتہ ہیں اور اللہ کے ہاں مقبول بھی، بلکہ ان کے اصل وارث وہ ہیں جو اُن کے راستے پر چلیں اور جو ہدایت کتاب اللہ نے عطا کی ہے ان کے مطابق زندگی کو استوار کریں۔ اللہ تعالیٰ کی اتنی واضح آیات و ہدایات کے بعد بھی اگر کچھ لوگ "پدرم سلطان بود" کا نعرہ لگائیں تو یہ اُن کی کجروی اور کج ذہنی ہے۔ جس سے اللہ کا کوئی واسطہ نہیں، اس کوڑھ مغزی کا خمیازہ وہ خود بھگت لیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم ع کو جو اولاد عطا فرمائی وہ دنیا میں شمس و قمر بن کر چمکی اور ایک عالم کو نورِ ہدایت سے منور کیا۔ اولادِ ابراہیم ع پر یہ اللہ تعالیٰ خصوصی انعام ہے کہ اس گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و کتاب سے سرفراز کیا اور نسلاً بعد نسلٍ اس خانوادے میں نبی پیدا ہوتے رہے۔

ابراہیم کا منفرد امتیاز

تاریخ معلوم میں حضرت ابراہیم ع وہ واحد شخص ہیں کہ جن کی چار نسلوں میں مسلسل نبوت رہی۔ وہ خود نبی تھے، پھر دو بیٹے اسمٰعیل و اسحاق علیہما السلام نبی ہوئے۔ ان کے بعد اسحاق کے بیٹے یعقوبؑ نبی ہوئے اور پھر یعقوبؑ کے بیٹے یوسف ع نبی ہوئے۔

یعقوب ع کا اعتراف نعمت

اللہ تعالیٰ کے اس احسان و فضل اور خصوصی انعام کا حضرت یعقوب ع نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ط اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (یوسف : ۶)

اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تو نے خواب میں دیکھا ہے کہ) تیرا رب تجھے (اپنے کام کے لئے) منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پورا کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق پر کر چکا ہے، یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے۔"

یوسفؑ کا اعتراف انعام

اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت یوسفؑ نے اعلان کیا:

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ○

(یوسف: ۳۸)

" واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں، در حقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اُس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ۔"

اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نعمت پوری کر دی اور یوسفؑ کو نبوت سے نوازا، حکومت عطا کی اور ایک عرصے کے بعد ماں باپ سے ملایا تو اعتراف نعمت کرتے ہوئے دعا کی۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ○ (یوسف: ۱۰۱)

" اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا ۔"

نسلِ ابراہیمؑ سے تعلق رکھنے والے انبیاء

اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی نسل سے جن انبیاء کو پیدا کیا ان کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر آیا ہے، سب سے زیادہ تفصیلی طور پر سورۂ انعام میں فرمایا:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ وَاَیُّوْبَ وَیُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ

وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ط كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ط وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ج وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الانعام: ۸۴-۸۷)

"پھر ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہِ راست دکھائی۔ (وہی راہ راست جو) اس سے پہلے نوح کو دکھائی تھی۔ اور اُسی کی نسل سے ہم نے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت بخشی)۔ اس طرح ہم نیکو کاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ (اُسی کی اولاد سے) زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو (راہ یاب کیا) ہر ایک اُن میں سے صالح تھا۔ (اُسی کے خاندان سے) اسماعیل، الیسع، یونس، اور لوط کو (راستہ دکھایا) ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور اُن کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، انھیں اپنی خدمت کے لئے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی۔"

یہ انسانیت کے وہ گلِ سرسبد تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو راہ دکھانے کے لئے چن لیا اور جن کی خوشبو سے سارا عالم مہک گیا۔ یہ چونکہ دنیا کے امام ہدیٰ تھے اس لئے سارے عالم پر ان کو فضیلت دی اور ان کو اپنی خاص نعمتوں سے نوازا۔ یہ خود بھی راہ یاب تھے اور دوسروں کو بھی راہ ہدایت دکھاتے تھے۔ یہ انسانیت کے قائد اور اس کے لئے نمونہ تھے۔ قیامت تک جتنے لوگ بھی راہِ ہدایت اختیار کریں گے وہ ان ہی حضرات کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ ان کے اتباع ہی میں راہِ ہدایت ہے، ان سے جو کچھ باہر ہے، وہ ضلالت ہی ضلالت ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علیحدہ ذکر کرنے کی حکمت

یہاں پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اولاً تو آپؐ خود ہی مخاطب تھے دوم یہ کہ آپؐ ان حضرات کے جدِ امجد حضرت ابراہیم عؑ کی دعا کی قبولیت کا مظہر تھے اس لئے بطور امتیاز آپ ؐ کا ذکر علیحدہ کیا۔ آپ کی تعریف میں مختلف مقامات پر ارشاد فرمایا، مثلاً۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۱۰۷)

"اور ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر۔"

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○ (القلم: ۴)

"اور بے شک تم اخلاق کے بلند مرتبہ پر فائز ہو۔"

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا: ۲۸)

"اور ہم نے تمہیں تمام انسانوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔"

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے صرف ان انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے جو نسلِ ابراہیمی سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور ہوئے۔ ان کے علاوہ اور کتنے ہی نبی ہوئے جن کا قرآن مجید میں صراحتاً ذکر نہیں۔ ان انبیاء علیہم السلام میں سے بعض حضرات کے مرتبہ اور مقام کا ان تعریفی کلمات کے ساتھ ذکر کیا ہے:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ○ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ○ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ○ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ○

"اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا ذکر کرو۔ بڑی قوت عمل رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے۔ ہم نے ان کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا اور وہ دارِ آخرت کی یاد تھی یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چنے ہوئے نیک اشخاص میں ہے، اور اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا ذکر کرو، یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔" (ص: ۴۵-۴۸)

اولادِ ابراہیم کی صفات

یہاں اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کی خصوصی تعریف و توصیف فرمائی ہے۔ ان کی پہلی صفت یہ بتائی کہ وہ بڑی قوتِ عمل رکھنے والے لوگ تھے۔ اللہ کا جو بھی حکم ان تک پہنچا اس پر پوری مستعدی سے عمل کیا اور اس کی تعمیل میں ذرا بھی سستی نہ دکھائی۔ اللہ کا پیغام پہنچانے میں ہر قسم کی سختی برداشت کی، ہر مخالفت کا سامنا کیا اور حالات کے سامنے سپر ڈالنے کی بجائے ان کا مقابلہ کر کے ان کا رُخ موڑ دیا۔ اللہ کا کلمہ بلند کرنے میں بڑی سے بڑی قربانی دی اور ہر آزمائش میں سرخرو ہو کر نکلے۔

دوسری صفت یہ بیان کی کہ وہ بڑے دیدہ ور لوگ تھے؛ یعنی بڑے عقل مند اور صاحبِ بصیرت لوگ تھے۔ ہر چھوٹے بڑے واقعے پر غور کرتے اور اس کی تہہ تک پہنچتے، ہر معاملے پر پوری بصیرت سے غور کرتے اور اس کے جملہ پہلوؤں پر نظر رکھتے، جو واقعات باعثِ عبرت ہوتے ان سے عبرت حاصل کرتے اور جو باعثِ نصیحت ہوتے ان سے نصیحت حاصل کرتے۔ اپنے ہر قول و فعل پر کڑی نظر رکھتے اور مرضیٔ الٰہی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے، اور پھر ان کی ایک بڑی صفت کا ذکر فرمایا جس سے ان حضرات کی زندگی کا گوشہ گوشہ منور تھا اور وہ صفت تھی یادِ آخرت۔ ہر معاملہ میں آخرت کو یاد رکھتے اور اس کی تیاری میں ہمہ وقت مصروف و مشغول رہتے۔ آخرت کی مسئولیت اور جواب دہی کا احساس ان پر ہر وقت طاری رہتا۔ فکرِ آخرت اور یادِ آخرت ان کا طغرائے امتیاز تھا، جس کی وجہ سے وہ ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کے بعد انسان کو راہِ راست پر قائم رکھنے والی سب سے بڑی چیز خوفِ آخرت ہی ہے۔ ہر مشکل میں یہ ثابت قدم رکھتی ہے۔ جس کے سامنے دنیا ہی دنیا ہو اور آخرت کا خوف نہ ہو وہ ہر وادی میں پھرتا ہے اور ہر موقع پر اس کا قدم پھسل جاتا ہے۔ جسے یادِ آخرت نصیب ہو اسے سب سے بڑی دولت مل گئی، اس دولت سے یہ سب حضرات مالا مال تھے۔

آخر میں حضرت اسمٰعیل، حضرت الیسع اور حضرت ذوالکفل کا ذکر فرمایا کہ یہ سب حضرات نیک تھے، ہر نیکی کے کام کو اختیار کرنے اور ہر بدی سے پرہیز کرتے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو نیکی کا معیار بنایا۔

ایسی نیک، نامور، برگزیدہ، چنی ہوئی اور ہدایت یافتہ اولاد اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اس قربانی کے عوض بطور انعام عطا فرمائی جو انھوں نے اللہ کی راہ میں دی۔ وہ قربانی کیا تھی؟ اس کے متعلق فرمایا:

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝

(مریم: ۴۹-۵۰)

"پس جب وہ اُن لوگوں سے اور اُن کے معبودانِ غیر اللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اس کو

اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی ناموری عطا کی۔"

ابراہیمؑ نے جب اپنے والد اور اپنی قوم سے علیحدہ ہو کر ہجرت اختیار کی تو لوگوں کا خیال تھا کہ یہ گم نام و بے آسرا، بلکہ وتنہا دنیا میں رہ جائیں گے لیکن جس شخص نے خدا کے لئے اپنے خاندان، اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑا اس کو خدا کیسے اکیلا چھوڑ سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ اولاد عطا فرمائی جو رہتی دنیا تک انسانوں کے لئے روشن ستارے بن کر راہِ ہدایت دکھاتے رہیں گے اور تمام ابرار واخیار کے ہادی ورہنما ہوں گے۔

کم ہمتوں کے لئے سامانِ رحمت

اس میں ان تمام لوگوں کے لئے بڑی نصیحت ہے جو مشکلات ومصائب سے گھبرا کر اور وقتی ناکامیوں اور حالات کی ناموافقت دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کا سب کیا دھرا اکارت گیا۔ دراصل انھیں اپنے خدا سے بدگمانی ہوتی ہے اور سمجھتے ہیں کہ اب اللہ ان کی مدد نہیں کرے گا۔ انھیں کیا معلوم کہ اللہ کے خزانوں میں ان کے لئے کیا کیا جمع ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یہ قدرت حاصل ہے کہ ان کے دن پھیر دے اور ان کی قربانیوں کے عوض انھیں وہ اجر عطا کرے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ابراہیمؑ کی دوسری دعا

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے بعد بھی مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور اس کی روز افزوں ترقی وآبادی دیکھ کر بے اختیار دعا مانگی:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِن شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۝

(ابراھیم: ۳۵-۴۱)

"یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے دعا کی تھی کہ "پروردگار، اس شہر کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے (ممکن ہے کہ میری اولاد کو بھی یہ گمراہ کر دیں، لہٰذا ان میں سے) جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ پروردگار! میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں، لہٰذا لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے، شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔ پروردگار! تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں ——— اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں۔ ——— شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق جیسے بیٹے دیئے، حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔ اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں) پروردگار! میری دعا قبول فرما۔ پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اُس دن معاف کر دیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا۔"

اکثر مفسر حضرات نے اس دعا کو حضرت ابراہیمؑ کی اُس پہلی ہی دعا کا حصہ قرار دیا ہے جو سورہ بقرہ میں مذکور ہے (آیات ۱۲۶ - ۱۲۹) مگر جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن جلد پنجم ص ۲۴۸ میں اشارہ کیا ہے، یہ دوسری دعا ہے جب کہ مکہ معظمہ آباد ہو چکا تھا۔

خود اس دعا کے الفاظ ہی شہادت دے رہے ہیں کہ یہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کے
بعد کی گئی تھی جیسا کہ آیت ۳۹ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ " شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے
میں اسماعیل اور اسحاق جیسے بیٹے دیئے " یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں کہ ابراہیم ؑ نے حضرت
اسحاق کی صرف بشارت سن کر کہہ دیا کہ " اس بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق جیسے بیٹے دیئے " لامحالہ
یہ الفاظ حضرت اسحاق کی پیدائش کے بعد ہی کہے گئے ہیں ۔

مطالبِ دعا

اب مضمون دعا کو سمجھئے ۔

حضرت ابراہیم ؑ نے اس دعا میں پہلی بات جو عرض کی وہ یہ تھی کہ پروردگار اس شہر کو پُرامن
بنا دیجئے ۔ اس دعا کی قبولیت جس طرح ظاہر ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو ظاہری اور باطنی طور پر جس
طرح مامون بنایا اس کی تفصیلات پہلے بیان کی جا چکی ہیں ۔

دوسری بات یہ عرض کی کہ مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیے ۔ بت پرستی کی لعنت
اور اس کے فتنوں کو ابراہیم ؑ خود دیکھ چکے تھے اور اس کی وجہ سے جن آزمائشوں سے دو چار ہوئے اُن
سے بھی وہ بخوبی واقف تھے ، اس لئے اپنی اور اپنی اولاد کی سلامتی کے لئے ایک مرتبہ پھر یہ دعا مانگی ، تاکہ
ان فتنوں سے دوبارہ دوچار نہ ہونا پڑے اور دنیا و آخرت محفوظ و مامون رہے ۔

تیسری بات یہ عرض کی کہ جو میرے راستے پر چلے وہ مجھ سے ہے اور اس کو اُن ہی انعامات
سے نوازا جائے جو مجھ پر کئے ہیں ۔ رہے وہ لوگ جو میری راہ پر نہ چلیں ، ان کو تیری رحمت و مغفرت کے
حوالے کرتا ہوں ۔ یہ الفاظ حضرت ابراہیم ؑ کی فطری رحمت و شفقت کے آئینہ دار ہیں جس کے متعلق
اللہ تعالیٰ نے فرمایا " اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ " (التوبہ : ۱۱۴) اگر وہ چاہتے تو کہہ سکتے
تھے کہ ان سب کو واصل جہنم کر، لیکن ان کی رحم دلی اور نرم دلی نے انھیں ایسا نہ کہنے دیا ۔

چوتھی بات یہ عرض کی کہ پروردگار میں نے اپنی اولاد کو یہاں اس لئے بسایا ہے کہ
یہاں نماز قائم کریں، کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے خالق سے جوڑے رکھتی ہے اور
اس کو فواحش و منکرات سے باز رکھتی ہے اور اس کو مقام عبدیت پر ثابت قدم رکھتی ہے ۔
اس ایک جملہ میں وہ ساری باتیں بیان کر دیں جو آپ اپنی اولاد میں دیکھنا چاہتے تھے یعنی د

پر استقامت، معاصی سے اجتناب، خدا کی بندگی پہ ثابت قدمی اور اس کی فرماں برداری و اطاعت پر دوام۔

پانچویں بات جو عرض کی، وہ یہ تھی کہ یہ ایک ایسی بنجر وغیر آباد زمین میں بسائے گئے ہیں وہاں نہ کچھ کھانے کو ہے نہ پہننے کو۔ ایسی جگہ پر نہ یہ زیادہ عرصے رہ سکیں گے اور نہ اطاعت و بندگی کے لئے جس سکون کی ضرورت ہے اُس سکون کے ساتھ عبادت کر سکیں گے۔ اس لئے انھیں ہر قسم کے ثمرات سے نواز۔ ثمرات سے مراد کھانے کے لئے پھل بھی ہیں اور محنتوں کے نتائج بھی۔

اس کے بعد اللہ کے اُس احسانِ عظیم کا شکر ادا کیا کہ اس بڑھاپے میں جب کہ بظاہر کوئی آثار نہ تھے، اللہ تعالیٰ نے نعمتِ اولاد سے نوازا اور اولاد بھی ایسی کہ جس سے دنیا اور آخرت میں دونوں جگہ نام روشن ہوا۔

اس اعتراف نعمت کے بعد پھر عرض کیا کہ میرے رب مجھے بھی نماز پہ قائم رکھ اور میری اولاد کو بھی نماز پر قائم رکھ۔ یہ دعا نماز کی فضیلت کا ایسا برملا اظہار ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی نماز پر قائم رہنے کی دعا مانگیں تو بڑا ہی بدنصیب ہے وہ شخص جو دولت ایمان پائے اور پھر نماز سے غفلت برتے۔

آخر میں اپنے ماں باپ اور تمام مومنین کی مغفرت کے لئے درخواست کی۔ مومنین کے لئے دعائے مغفرت کی، تو یہ اُن کا حق تھا۔ نبی اگر اپنی امت کے لئے مغفرت طلب نہ کرے تو کون کرے گا۔ لیکن ماں باپ کے لئے مغفرت طلب کرنا، جب کہ وہ کافر تھے، اس بنا پر تھا کہ آپ نے اپنے گھر سے روانہ ہوتے وقت اپنے والد سے از خود وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے لئے مغفرت طلب کروں گا۔ پھر یہ اس فطری تعلق اور محبت کی وجہ سے بھی کی جو ایک سعادت مند اولاد کو اپنے ماں باپ سے ہوتی ہے۔ اس لئے ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کی مغفرت کے لئے دعا کرے، لیکن آپ کی یہ دعائے مغفرت اس وقت تک ہی تھی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشرکین کے لئے مغفرت طلب کرنے کی ممانعت نہ آگئی۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ اللہ کو یہ پسند نہیں کہ مشرکین کے لئے، خواہ وہ ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں، دعائے مغفرت کی جائے، تو آپ نے اس کو ترک کر دیا۔

فضیلتِ ابراہیم علیہ السلام

ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت عطا فرمائی وہ پچھلے صفحات میں پوری طرح عیاں ہو چکی۔ ان کو جو نامور اور برگزیدہ اولاد عطا فرمائی اور ان کی نسل در نسل میں جس طرح سلسلہ نبوت جاری رہا وہی آپ کی فضیلت و عظمت کے لئے کافی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو مرتبۂ عالی عطا فرمایا وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ برگزیدہ اولاد تو اس کرامت کا ایک حصہ ہے جو آپ کے حصہ میں آئی تھی۔ اب ہم ترتیب وار آپ کے وہ فضائل بیان کریں گے جو قرآن پاک میں بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

دنیا میں ممتاز و منتخب افراد

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

(آل عمران: ۳۳)

"اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لئے) منتخب کیا۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کو (جن میں بنی اسمٰعیل اور بنی اسحاق دونوں شامل ہیں) سندِ امتیاز عطا فرمائی اور بتایا کہ یہ حضرات، حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کی طرح دنیا میں چھنے ہوئے اور ممتاز افراد تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ انسانیت ـــــ نبوت ـــــ سے سرفراز فرمایا۔

اولادِ ابراہیمؑ کو نبوت اور وحی سے نوازنے کی تفصیل یوں بیان فرمائی:

اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (النساء: ۱۶۳)

"اے محمدؐ، ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔ ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی۔ ہم نے داؤدؑ کو زبور دی۔"

دوسری جگہ اپنے انعامات کا ذکر یوں فرمایا:

کتاب و حکمت کی نوازش

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ج فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا O (النساء: ۵۴)

"پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انھیں اپنے فضل سے نواز دیا، اگر یہ بات ہے تو انھیں معلوم ہو کہ ہم نے ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملکِ عظیم بخش دیا۔"

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر تین عظیم انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔

۱۔ انھیں کتاب دی۔ دنیا میں جتنی بھی الہامی کتابیں پائی جاتی ہیں وہ سب ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر نازل کی گئیں۔ ان میں سے معلوم و مشہور حسب ذیل ہیں۔

ا۔ صحفِ ابراہیم ———— جو حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہوئے۔

ب۔ زبور ———— جو داؤدؑ پر نازل کی گئی۔

ج۔ توراۃ ———— جو موسیٰؑ پر نازل کی گئی۔

د۔ انجیل ———— جو عیسیٰؑ پر نازل کی گئی۔

ہ۔ قرآن مجید ———— دنیا کے لیے آخری کتابِ ہدایت، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔

اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب برگزیدہ حضرات، ابراہیمؑ ہی کی نسل میں سے ہیں

۲۔ انھیں حکمت دی گئی۔ آج دنیا میں عقل و دانش کی جتنی بھی تعلیمات پائی جاتی ہیں اور اخلاق فاضلہ کی جتنی نشانیاں پائی جاتی ہیں وہ سب ان ہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعے دنیا کو ملیں

جو حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

عظیم اقتدار کی بخشش

۳۔ انھیں ملک عظیم بخش دیا۔ حضرت یوسفؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور آخر میں نبی اکرم محمد صلی اللہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جس شان کا اقتدار عطا کیا اُس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ جو نظام ان برگزیدہ انسانوں نے قائم کیا، اس جیسا نظام قائم کرنا تو بہت بڑی چیز ہے، اس کی ایک جھلک دیکھنا ہی آج دنیا کی سب سے بڑی ضرورت و خواہش ہے۔

خدا سے انعام یافتہ

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ○ (مریم: ۵۸)

"یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا آدم کی اولاد میں سے، اور اُن لوگوں کی نسل سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا، اور ابراہیم کی نسل سے اور اسرائیل کی نسل سے۔ اور یہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمٰن کی آیات اُن کو سنائی جائیں تو روتے ہوئے سجدہ میں گر جاتے تھے۔"

(یہاں پر سجدہ کرنا واجب ہے، اس لئے قارئین اس آیت کی تلاوت کرتے وقت سجدہ کریں)

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم کو صاف طور پر انعام یافتہ فرمایا ہے جس کو اللہ کی سرکار سے انعام یافتہ ہونے کی سند مل جائے اس میں کون کلام کر سکتا ہے۔ اور اُن سے بڑھ کر کون خوش نصیب ہو سکتا ہے۔

آیاتِ الٰہی کے لئے چشم پُرآب

یہاں پر ان حضرات کی ایک اور صفت کا بھی بیان ہوا ہے اور وہ یہ کہ جب ان کو اللہ کی

کی آیات سنائی جاتی تھیں تو وہ نہ اُن سے آنکھیں پھیرتے تھے، نہ رخ موڑتے تھے، نہ اُن کو نظر انداز کرتے تھے بلکہ سرتاپا تسلیم و رضا بن جاتے تھے اور اُن کی پوری پوری تعمیل کرتے تھے۔ نشان تعمیل کے طور پر اللہ کی آیات سن کر بے اختیار سجدہ میں گر جاتے تھے، اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے خدا کی جناب میں گڑگڑاتے تھے۔

یہ ہے مومنین کے لئے اسوہ کہ جب انھیں خدا کا کلام سنایا جائے تو انھیں کس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ مومن خدا کے سامنے کبھی سرکش و متمرد نہیں ہو سکتا، وہ تو اپنے خالق کے سامنے سراپا عجز و انکسار ہوتا ہے اور یہی اس کی معراج ہے ۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ابراہیمؑ پر ایمان

ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت و بزرگی عطا کی تھی یہ اُس کا تقاضا ہے کہ اُن کی رسالت پر ایمان لایا جائے۔ یہ ایمان بالرسل کی تعمیل ہے اور اُس سلسلۂ انقیاد کی توقیر ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوا اور محمد رسول اللہ علیہ وسلّم پر ختم ہوا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (البقرۃ: ۱۳۶، ۱۳۷)

"مسلمانو، کہو کہ: "ہم ایمان لائے اللہ پر اور اُس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم اُن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔

پھر اگر وہ اُسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم لائے ہو، تو ہدایت پر ہیں، اور اگر اس سے منہ پھیریں، تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں، لہٰذا یاد رکھو کہ اُن کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لیئے کافی ہے۔

وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔"

جس طرح محمدؐ رسول اللہ کو ماننے والوں پر یہ لازم ہے کہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائیں، اسی طرح تمام انبیاء کی امتوں پر یہ فرض ہے کہ وہ تمام نبیوں پر ایمان لائیں اور اُن میں کوئی تفریق نہ کریں کہ کچھ پر ایمان لائیں اور کچھ پر نہ لائیں ۔ ایک نبی کا انکار، اللہ کے بھیجے ہوئے تمام انبیاء کے انکار کا ہم معنی ہے ۔

دوسری جگہ اس ہی بات کو اس طرح بیان فرمایا :

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○

(آل عمران : ۸۴)

"اے نبی، کہو کہ " ہم اللہ کو مانتے ہیں، اُس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل پر نازل کی گئی ہے ، ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیم، اسمٰعیل، یعقوب اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوئی تھیں، اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئیں ۔ ہم اُن درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان (مسلم) ہیں ۔"

نبوتِ ابراہیم کی توثیق

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○

(الاحزاب : ۷)

"اور (اے نبیؐ) یاد رکھو اُس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی، سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں ۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے اس عہد کا ذکر فرمایا ہے جو تمام انبیاء سے اس بارے میں لیا تھا کہ وہ

اللہ کی اطاعت میں کسی سے نہ ڈریں گے اور نہ جھکیں گے اور ہر چیز پر اللہ کی اطاعت کو مقدم رکھیں گے۔ جس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے یہ عہد لیا تھا، اُسی طرح ابراہیمؑ سے بھی یہ عہد لیا گیا تھا۔ ابراہیمؑ ان اولوالعزم اور بلند مرتبہ انبیاء میں سے ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ہر اہم موقع پر کیا ہے۔

اب جب کہ ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا یہ بات ثابت ہو گئی کہ ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اور ہر نبی پر ایمان لانا یکساں فرض ہے تو ابوالانبیاء ابراہیمؑ کی رسالت پر بھی ایمان لانا فرض ہے اور جو کوئی آپ کی نبوت سے انکار کرتا ہے وہ گویا اُس پورے سلسلۂ نبوت سے انکار کرتا ہے، جس سے آپ تعلق رکھتے تھے۔

اتباعِ ابراہیمؑ

ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جو قدر و منزلت عطا فرمائی تھی اس کا تقاضا تھا کہ ابراہیمؑ کا زندگی کے ہر معاملے میں اتباع کیا جائے اور اُن کی روشن زندگی کو مشعلِ راہ بنایا جائے چنانچہ ارشاد فرمایا:

حنیفیت

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (آل عمران : ۹۵)

"کہو، اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے، تم کو یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرنا چاہیئے، اور ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔"

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی دو خصوصیات کا خاص طور پہ ذکر فرمایا ہے۔

۱۔ ابراہیم علیہ السلام حنیف (یکسو) تھے۔

ابراہیمؑ کی پوری زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آپ سارے جہاں سے کٹ کر صرف ایک خدا کے ہو کر رہ گئے۔ خدا کی خاطر انھوں نے اپنے والد کو چھوڑا، اپنی قوم سے کنارہ کش ہوئے، اُسی کی خاطر اپنا وطن چھوڑا، اُسی کی خاطر اپنا گھر بار اور عیش و آرام تج دیا، اُس کے دین کے لئے عراق، فلسطین، مصر اور حجاز کی خاک چھانی۔ جب اُس نے پکارا تو اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور اپنے طور پر تو ذبح ہی کر ڈالا تھا اور یا نہ ہے کہ اللہ نے اپنے فضل سے بیٹے کو بچا لیا، اسی کی خاطر اپنی زوجہ اور شیر خوار بچے کو ایک بے آب و گیاہ چٹیل میدان میں چھوڑ دیا؛ غرض وہ کون سی قربانی تھی جو انھوں نے خدا کی راہ میں پیش نہ کی ہو۔

پھر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کسی بھی موقع پر وہ نہ کسی تذبذب کا شکار ہوئے، نہ تعمیل حکم

میں کوئی ہچکچاہٹ دکھائی اور نہ ہی خدا کے سوا کسی دوسرے سے آس لگائی۔ ان کا واحد سہارا اور ملجا و ماویٰ صرف اللہ تھا۔ اس کی مرضی پوری کرنا ان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین تھا یہی حقیقت اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندۂ مومن میں دیکھنا چاہتا ہے اور اس ہی کے اتباع کی دعوت دی گئی ہے۔

شرک بیزاری

۲۔ وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ یہ حنیفیت کا لازمہ اور اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ شرک کی ایک شکل اصنام پرستی اور کواکب پرستی ہے۔ اس سے وہ آغاز جوانی ہی سے بیزار تھے۔ اس بیزاری کو انھوں نے نہ صرف یہ کہ کبھی چھپایا نہیں بلکہ ہر موقع پر اس بیزاری کا اظہار کیا، اس کے لئے بڑے سے بڑے خطرات برداشت کیے۔ شرک کی دوسری شکل اللہ کی صفات میں کسی کو شریک کرنا ہے۔ کسی دوسرے سے مدد طلب کرنا، کسی سے آس لگانا، کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا یہ سب شرک ہی کے مظاہر ہیں۔ آپ کو جب آگ میں پھینکا گیا تو یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ ایسے موقع پر آدمی جان بچانے کے لئے دوسروں کے سامنے گڑگڑاتا ہے، رحم کی بھیک مانگتا ہے اور مدد کا طلب گار ہوتا ہے، لیکن آپ کی شان دیکھیے کہ اس نازک موقع پر آپ کی زبان سے کیا نکلتا ہے۔

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ○

"اللہ ہی ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔"

جب بپھری ہوئی قوم آپ کا چاروں طرف سے گھیراؤ کرتی ہے اور اپنے معبودان باطل کی حمایت میں آپ کی تکابوٹی کرنے کے لئے تیار نظر آتی ہے تو ایسے خطرناک موقع پر بھی ایک اعلان حق آپ کی زبان پر ہوتا ہے اور وہ یہ:

"اور میں ان سے کیسے ڈروں جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو جب کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہوئے نہیں ڈرتے جس کے لئے اس نے تمہیں کوئی سند نہیں دی۔"

یہی آپ کا وہ اسوہ ہے جس کو بار بار نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور جس کو اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے، پھر فرمایا کہ اتباع ابراہیم سے بہتر کوئی بات نہیں اور اس شخص سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہو سکتا جس نے ابراہیمؑ کا اتباع کیا۔

خلیل اللہؑ

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝ (النساء: ۱۲۵)

"اُس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے کی پیروی کی، اُس ابراہیم کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا۔"

پھر بتایا کہ جو شخص ابراہیمؑ کے اتباع سے انکار کرتا ہے وہ بے وقوف وسفیہ ہے:

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (البقرہ: ۱۳۰-۱۳۱)

"اب کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت وجہالت میں مبتلا کر لیا ہو، اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے؟ ابراہیم تو وہ شخص ہے، جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لیے چن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ اُس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اُس سے کہا: "مسلم ہو جا،" تو اُس نے فوراً کہا: "میں مالک کائنات کا 'مسلم' ہو گیا"

ابراہیمؑ کی پیروی کے سب سے زیادہ حقدار؟

پھر بتایا کہ ابراہیمؑ کے اتباع کے سب سے زیادہ حقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھ ایمان لانے والے حضرات ہیں، کیونکہ جس دعوت کے حضرت ابراہیمؑ علم بردار تھے، اس دعوت کو بلند کرنے والے اب حضورؐ اور آپؐ کے مبارک ساتھی ہی ہیں۔ دوسرے تمام لوگوں کو حضرت ابراہیمؑ سے صرف نام کی نسبت ہے۔ ارشاد ہوا:

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران: ۶۸)

"ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے

اُس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔"

دوسرے مقام پر اتباعِ ابراہیمی کے دلائل دیتے ہوئے فرمایا:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

(النحل : ۱۲۰-۱۲۳)

"واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا، اللہ کا مطیعِ فرمان اور یکسو، وہ کبھی مشرک نہ تھا، اللہ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو منتخب کرلیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ دنیا میں اس کو بھلائی دی اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔ پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔"

خصوصیاتِ ابراہیمؑ کا جامع تعارف

یہاں ابراہیم علیہ السلام کی خصوصیات کا جامع تعارف کرایا گیا ہے اور آپ کے مقام و شرف کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

اپنی ذات میں امت

یہاں پہلی بات یہ بتائی گئی کہ ابراہیمؑ اپنی ذات میں خود ایک امت تھے۔ جو کام اور جتنے کام ایک امت کے کرنے کے ہیں وہ سب ایک ذات والا تبار نے انجام دیئے۔ اور ان تمام کاموں کی انجام دہی میں پوری یک سوئی سے منہمک ہو گئے۔ کسی لالچ، کسی خوف اور کسی دباؤ نے نہ انھیں اپنی جگہ سے ہٹایا اور نہ ہی اپنی طرف ان کی توجہ کھینچ سکا۔

شکر گزار و احسان شناس

دوسری بات یہ بتائی کہ وہ اللہ کے ایک شکر گزار اور احسان ماننے والے بندے تھے۔ اُن پر اللہ تعالیٰ کے جتنے احسانات بڑھتے گئے اتنا ہی ان کا جذبۂ جاں سپاری اور فدا کاری بڑھتا گیا۔ کسی نعمت کے حصول پر نہ وہ اترائے اور نہ خوشی میں اپنے نصب العین سے ایک انچ ہٹے۔

احسان شناسی کا صلہ

اس احسان شناسی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو مقام خاص عطا کیا، ہدایت پر استقامت بخشی، دنیا میں ان کو امامت اور سچی ناموری عطا کی کہ آج بھی ہزاروں سال کے بعد بھی کروڑوں افراد ان کے نام مبارک پر درود و سلام بھیجتے اور انہیں اپنا ہادی و مرشد مانتے ہیں۔ یہ تو اُن کا دنیا میں مرتبہ رہا۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو صالح بندوں میں اٹھائے گا، انھیں میں آپ کا شمار ہوگا اور انھیں کے ساتھ انعامات سے نوازے جائیں گے۔ جسے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیاں مل جائیں اُسے پھر اور کس چیز کی ضرورت رہ جاتی ہے۔

حنیف

آپ کی اسی حنیفیت اور شرک بیزاری کو بطور اُسوہ پیش کیا گیا اور نبیؐ اور امت مسلمہ کو حکم دیا کہ اس اسوہ کو اختیار کریں اور اُس جھنڈے کو بلند رکھیں جسے ابراہیمؑ نے اٹھایا تھا۔ اسی ہی کے اتباع کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اعلان کردیں کہ:

ابراہیمؑ کے حقیقی تبع

قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○

(الانعام: ۱۶۱، ۱۶۳)

"اے محمدؐ، کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیم کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اُس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو! میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور

میرا مرنا ، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ "

پہلے سورۂ آل عمران کی آیت میں یہ تصریح کی جا چکی ہے کہ ابراہیمؑ کی پیروی کے سب سے زیادہ حق دار نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین ہیں ۔ اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس حق کے صرف دعویدار ہی نہیں، بلکہ عملاً بھی ابراہیمؑ کے طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اللہ نے آپؐ کو حکم دیا اور آپؐ نے سب سے پہلے اس کی تعمیل کی ۔ اس ہی حقیقت کا آپؐ سے مندرجہ بالا آیت کے ذریعہ اعلان کرا دیا گیا کہ جس راہ مستقیم پر ابراہیمؑ گامزن تھے اس ہی راہِ ہدایت کا میں بھی اتباع کر رہا ہوں جس طرح ابراہیمؑ ہر قسم کے شرک سے بری اور مسلم حنیف تھے ، میں بھی ہوں ۔ اس ہی حنیفیت کا یہ اظہار ہے کہ میری نماز میرے تمام مراسم عبودیت ، میرا مرنا اور جینا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آخری سانس تک آپؐ نے اس حکم ربیؐ کی اطاعت و تعمیل کی ۔

جہاں نبیؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ حضرت ابراہیمؑ کے طریقہ پر چلیں وہیں امت مسلمہ کو بھی یہی حکم دیا گیا ۔ گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی حیثیت سے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ وسلم کے راستہ کو اختیار کرے لیکن اس حکم کی اہمیت بتانے اور ابراہیمؑ کی فضیلت و مرتبت بتانے کے لئے علیحدہ سے حکم دیا کہ :

امت مسلمہ کے لئے حضور کو ہدایت

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ○

(الحج: ۷۸)

" اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے ۔ اُس نے تمہیں اپنے

کام کے لئے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی
کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا
یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ
اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ، بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار"

یہاں اللہ تعالیٰ نے وہ مقصد بھی بتا دیا جس کے لئے ابراہیمؑ زندگی بھر کام کرتے اور امتِ
مسلمہ کی ذمہ داری بھی بتائی۔ ابراہیمؑ کا مقام بھی بتایا اور کام بھی۔ آپ کی متبع ہونے کی حیثیت سے
امتِ مسلمہ کا جو مقام ہے اور اس کو جو کام انجام دینا ہیں وہ بھی بتا دیئے

جہاد فی سبیل اللہ

پہلی بات یہ بتائی کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔ ابراہیمؑ نے اپنی
پوری زندگی اللہ کے دین کے لئے وقف کر دی۔ اپنا مال، اپنی جان، اپنی صلاحیتیں، اپنی اولاد، اپنے
اوقات سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دیئے۔ اب ان کی ملت میں ہونے کا حق یہ ہے کہ تم بھی اپنی جان
و مال، دولت و عزت، وقت و صلاحیت سب کچھ اللہ کے دین کے لئے وقف کر دو۔

چنیدہ امت

دوسری بات یہ کہ اللہ نے تمہیں اس کام کے لئے چُن لیا ہے۔ یہ سعادت تمہارے حصہ
میں آئی ہے کہ اس کام کو اللہ تعالیٰ تم سے لینا چاہتا ہے۔ یہ مرتبہ و مقام تمہیں صرف اس لئے حاصل
ہوا ہے کہ تم ملت ابراہیمی سے تعلق رکھتے ہو۔

مُسلِم

تیسری بات یہ بتائی کہ اللہ تعالیٰ نے اس ملت کا نام "مسلم" رکھا ہے۔ تم سے پہلے جتنے
لوگ اس کام کے لئے آگے بڑھے سب "مسلم" تھے اور اب یہ خطاب تمہیں عطا کیا گیا ہے۔ یہ خطاب
"مسلم" ــــــ یعنی بندۂ فرمان بردار وہ لقب ہے جس پر ایک انسان جتنا بھی ناز
کرے کم ہے۔ اب اس لقب کی لاج رکھنا اور اس کا مستحق بننا تمہارے اپنے اوپر موقوف ہے۔

ابلاغ دین

چوتھی بات یہ بتائی کہ جس طرح نبیؐ نے اپنے قول سے، اپنے فعل سے، اپنے عمل سے اپنے

طریقے سے، اپنی گفتار سے، اپنے کردار سے، اپنے سلوک اور رویے سے، اللہ کا دین تم تک پہنچایا، اسی طرح سے تم بھی دوسروں تک اللہ کا دین پہنچاؤ۔ جس طرح اللہ کے رسول سے گواہی لی جائے گی کہ پورے کا پورا دین بہ تمام و کمال تم تک پہنچا دیا، اسی طرح تم کو بھی اس کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ کل تم کو بھی اللہ کے حضور گواہی دینا ہوگی کہ اللہ کے دین کو بہ تمام و کمال دوسروں تک پہونچا دیا ہے۔ اگر اس کام میں کوتاہی کی تو اس کا وبال بھی اتنا ہی عظیم ہوگا جتنا اس کا مقام ہے۔

شعائر امتِ مسلمہ

پانچویں بات یہ بتائی کہ امتِ مسلمہ کی حیثیت سے تمہارا شعار نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا اور اللہ سے کلّیۃً وابستہ ہو جانا ہے۔ پس اپنے اس شعار کو کسی حال میں نہ بھولنا اور اس کی پابندی کرتے رہنا۔

اور آخر میں فرمایا کہ اگر تم ان فرائض کو پوری طرح ادا کرتے رہے تو اللہ کی نصرت و حمایت تمہیں حاصل رہے گی اور اللہ جس کا مولیٰ ہو اُسے کسی دوسرے حامی و مددگار کی ضرورت نہیں، وہ سب سے بڑھ کر اور بہتر آقا و مولا ہے۔ دوسرے مقام پر امت مسلمہ کی غرض و غایت کی تفصیل یوں بیان فرمائی:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ (الشوریٰ: ۱۳)

"اُس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوح کو دیا تھا، اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اُس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔"

یعنی ابراہیمؑ اُسی سلسلۃ الذہب کی کڑی ہیں جو نوحؑ سے شروع ہو کر محمد عربیؐ پر ختم ہو گیا۔ ہم نے ان سب انبیاء کو جو اس سلسلہ سے منسلک ہیں اپنی وحی سے نوازا اور ان سب کے سپرد ایک ہی کام کیا اور وہ تھا اقامت دین۔

جب سب جلیل القدر انبیاء کا یہ فرض تھا کہ وہ دین کو قائم کریں تو ان انبیاء کی جانشین اور

وارث امت مسلمہ کا یہ اہم ترین فریضہ ہے کہ وہ دین کو قائم کرے۔

دین کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دین اپنی صحیح اور مکمل شکل میں اس دنیا میں ظاہر ہو اور دنیا کا پورا نظام زندگی اس کے تابع ہو کر رہے اور اس کی ہدایات کے مطابق چلے۔ ہر جگہ اس ہی کا سکہ چلے، اس ہی کے احکام نافذ ہوں اور زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو۔ جو قوم اس فریضہ کو انجام دے، وہی ملت ابراہیمی ہے، وہی امت مسلمہ ہے اور وہی جانشین انبیاء ہے۔ اگر یہ نہیں تو نام کچھ بھی رکھ لو۔ اللہ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔

نام نہاد تعلق رکھنے والوں کو انتباہ

ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جس ہدایت سے نوازا، اس ہدایت پر آپ نے جس طرح عمل کیا، اس ہدایت ربانی کو پھیلانے میں آپ نے جو جد و جہد کی اور اس کی خاطر آپ نے جو قربانیاں دیں، ان کا تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس جد و جہد کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کامرانی عطا فرمائی اور جو انعامات عطا کئے، ان کو بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ انہی انعامات میں سے ایک انعام یہ تھا کہ آپ کی نسل میں سلسلۂ نبوت جاری فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ ہی کی نسل میں نبوت ختم کی۔ آپ کو وہ سچی ناموری عطا کی کہ کروڑوں افراد آپ کے نام نامی پر درود و سلام بھیجتے ہیں، اور قیامت تک بھیجتے رہیں گے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی قومیں، یہود، نصاریٰ اور قریش مکہ اس بات کی مدعی تھیں کہ وہ نسل ابراہیمی سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے وہ ہی ہدایت یافتہ ہیں اور انھیں دوسری اقوام پر فضیلت حاصل ہے۔ ان کے اس ادّعا کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

ملت ابراہیمی ـــــ سب ملتوں سے جدا

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۳۵)

"یہودی کہتے ہیں: "یہودی ہو تو راہ راست پاؤ گے۔" عیسائی کہتے ہیں "عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔" ان سے کہو: نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ۔ اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا۔"

یہاں ان بزعم خویش ہدایت یافتہ گروہوں کے اس زعم باطل کی صاف تردید کی اور بتایا کہ

ملت ابراہیمی کسی نسل یا خاندان کا نام نہیں بلکہ اُس عقیدہ اور عمل کا نام ہے جو ابراہیمؑ نے اختیار کیا تھا۔ تمہیں ابراہیمؑ سے کیا نسبت ہو سکتی ہے جب کہ تم قسم قسم کے شرک میں مبتلا ہو حالانکہ ابراہیمؑ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر قسم کے شرک سے بری تھے۔

دوسرے مقام پر اس اِدّعائے باطل کی اور بھی پُرزور تردید کرتے ہوئے فرمایا:

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (البقرۃ: ۱۴۰)

"یا پھر کیا تمہارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ کہو، تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا، جس کے ذمے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اُسے چھپائے؟ تمہاری حرکات سے اللہ غافل تو نہیں ہے۔"

جو جہلاء یہ سمجھتے تھے کہ ابراہیمؑ یہودی تھے یا نصرانی، انھیں دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا گیا کہ ابراہیمؑ ان دونوں میں سے کسی گروہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ تم جو سمجھتے ہو کہ ابراہیمیت کسی نسلی یا قومی دین کا نام ہے تو یہ سراسر غلط اور باطل ہے۔ کیا ابراہیمؑ کے بارے میں تمہاری معلومات زیادہ ہیں یا اُس اللہ کی جس نے انھیں پیدا کیا اور نبوت عطا کی۔ کیا تمہارا کوئی عالم یہ بتا سکتا ہے کہ ابراہیمؑ کب یہودی یا عیسائی ہوئے اور تمہارے کس فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر تم واقعی ابراہیمؑ سے تعلق رکھتے ہو تو سچ سچ بتاؤ کہ حقیقت کیا ہے، لیکن تم کبھی بھی حقیقت بیان نہیں کر سکتے۔ تمہارا یہ کتمانِ حق اللہ سے پوشیدہ نہیں اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے پوری طرح واقف ہے۔

ابراہیمؑ کے بارے میں بے بنیاد دعوے

اس کے بعد یہود و نصاریٰ کو خاص طور پر مخاطب کرتے ہوئے ان ہی کی دلیل سے ان کے دعوے کا ابطال کیا۔ فرمایا:

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِىْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (آل عمران: ۶۵)

"اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں، پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟"

یہ ایسی مسکت دلیل تھی جس کے بعد ان کا منہ بند ہو جانا چاہیے تھا، لیکن جن لوگوں کی بنیاد ہی نسلی وقومی تفاخر پر ہو وہ ایسی دلیلوں سے کب باز آنے والے تھے، وہ اس کے بعد بھی وہی رٹ لگائے چلے گئے کہ نہیں، ابراہیم ع یہودی تھے، عیسائی تھے۔ ان کی اس ہٹ دھرمی کا جواب پھر نہایت دو ٹوک الفاظ میں یوں دیا:

نہ یہودی نہ نصرانی

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (آل عمران : ۶۷)

"ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔"

اور ظاہر ہے کہ ابراہیم ع سے اپنا تعلق وہی جتا سکتا ہے جو خود بھی مسلم حنیف ہو، تم جب کہ یہودی ہو یا عیسائی اور مسلم حنیف نہیں ہو تو پھر تمہارا ابراہیم علیہ السلام سے کیا تعلق؟

وصیت ابراہیم ع و یعقوب ع

ابراہیم ع اور اُن کی اولاد جس راہ پر گامزن تھی اور اُن کا جو مسلک وعقیدہ تھا اس کو خود انھوں نے اپنے وقتِ آخر ان الفاظ میں دہرایا:

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۳۲ - ۱۳۴)

"اور اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت ابراہیم نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت

یعقوب اپنی اولاد کو کر گیا۔ اُس نے کہا تھا کہ "میرے بچو"، اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے، لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا، پھر کیا تم اُس وقت موجود تھے، جب یعقوب اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اُس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا 'بچو' تم میرے بعد کس کی بندگی کرو گے؟ اُن سب نے جواب دیا: "ہم اُسی ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق نے خدا مانا ہے اور ہم اُسی کے مسلم ہیں" وہ کچھ لوگ تھے جو گزر گئے، جو کچھ انھوں کمایا، وہ اُن کے لیے ہے، اور جو کچھ تم کماؤ گے، وہ تمہارے لیے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔"

ہر انسان خواہ وہ فرمانبردار ہو یا نافرماں، متقی ہو یا گنہگار، جب مرنے کے قریب ہوتا ہے اور موت کے فرشتے اس کی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتے ہیں، تو صرف سچی بات ہی کہتا ہے بڑے بڑے اکڑ بازوں کی ہیکڑی نکل جاتی ہے اور اعترافِ حق کے سوا کچھ نہیں بن پڑتی۔ ایسی حالت میں ایک عام شخص بھی اگر کوئی بات کہتا ہے تو وہ قابلِ یقین ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر انبیا علیہم السلام کوئی بات کہیں، جب کہ وہ ساری زندگی میں راست بازی ہوتے ہیں تو اُس سے زیادہ سچی بات کیا ہو سکتی ہے؟ ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام جن کو یہود و نصاریٰ دونوں ہی نبی تسلیم کرتے ہیں، اگر وقتِ آخر کوئی وصیت کرتے ہیں، تو وہ ان دونوں گروہوں کے لئے قابلِ قبول ہونا چاہیے۔ اب دیکھئے ان دونوں حضرات نے اپنی اولاد کو کیا وصیت کی۔ اس وصیت کو تم جانتے ہو اور تمہاری کتابوں میں بھی لکھی ہوئی ہے۔ اب اگر تم اپنی کجروی کی بنا پر اُسے ظاہر نہیں کرتے تو آؤ ہم تمہیں بتاتے ہیں۔

ان دونوں بزرگوں نے یہ وصیت کی تھی کہ اے میرے بچو! اللہ نے تمہارے لئے یہی دین یعنی اسلام پسند کیا ہے، اس لیے تم مرتے دم تک اس پر عمل پیرا رہنا، یعنی مسلم بن کر رہنا۔

یہ دین کوئی جز وقتی چیز نہیں کہ زندگی کے کسی خاص حصہ میں اس پر عمل کرو اور دوسرے حصوں میں اسے نظر انداز کرتے رہو۔ نہ یہ کوئی ایسی اختیاری چیز ہے کہ اس کے جس حصہ پر طبیعت چاہے تو عمل کر لو اور جس جس حصے کو چاہو چھوڑ دو۔ قرآن مجید نے ایسے بیشمار واقعات کی نشاندہی کی ہے کہ انھوں

نے اس دین کے ایک حصے کو مانا اور دوسرے حصے کو چھوڑ دیا ۔ اس بات کو قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے ۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج (البقرۃ : ۸۵)

"کیا تم کتاب کے کچھ حصے کو مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو ۔"

یہ دین تو زندگی کا ہمہ وقتی سودا ہے کہ جس کو زندگی کے ہر لمحہ پر ترجیح بنائے رکھنا ہے ہوش سنبھالنے سے آخری سانس تک اس کو اپنانا ہے اور اس پر عمل کرنا ہے ۔ پھر یہ دین ناقابل تقسیم بھی ہے ، اس کے حصے بخرے بھی نہیں ہو سکتے ، اس کو پورے کا پورا اختیار کرنا ہو گا ۔ عقائد و عبادات بھی اس ہی سے لینا ہے ، معاشرت و معیشت بھی اس ہی کے مطابق ڈھالنا ہے ، جنگ و صلح بھی اس ہی کے مطابق کرنا ہے ، تجارت و سیاست بھی اسی کے مطابق چلانا ہے ۔ اس کے کسی حصے کو اپنانے اور کسی حصے کو چھوڑنے کا کسی کو بھی اختیار نہیں ۔

پھر دیکھو ، یعقوب علیہ السلام نے (جن کا دوسرا نام اسرائیل ہے) وقتِ آخر اپنی اولاد سے کیا عہد لیا تھا ۔ جب آپ پر حالات مرگ طاری ہونے لگے تو آپ نے اپنے سب بیٹوں کو اکٹھا کیا اور ان سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے ؟ تو سب نے یک زبان ہو کر اقرار کیا کہ ہم اُس ہی خدا کی بندگی و اطاعت کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بلند مرتبہ آباؤ اجداد اسماعیل و اسحاق اور ابراہیم علیہم السلام بندگی کرتے تھے ، اور ہم اس ہی کے تابعدار و فرمان بردار مسلم بن کر رہیں گے ۔ اب اگر تم اس عہد پر قائم رہتے ہو تب تو ان کے وارث کہلانے کے مستحق ہو ، ورنہ نہیں ان سے کوئی نسبت نہیں ۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ، ان کے اعمال نہ تمہارے کچھ کام آسکیں گے اور نہ اُن کے بارے میں تمہیں کچھ جواب دہی کرنا ہو گی ۔ اپنے اعمال کے تم خود ہی ذمہ دار ہو گے ۔

منکرینِ دعوت کے لئے جہنم کی وعید

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝

(النسآء : ۵۵)

"مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا ، اور منہ موڑنے والوں

کے لئے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے ۔"

اب جن لوگوں نے منہ موڑا ہے وہ اپنا انجام سن لیں، کہ نسلِ ابراہیمی سے تعلق رکھنا ان کے کسی کام نہ آئے گا اور وہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے ۔

ناخلف اولاد کے کرتوت

ان برگزیدہ انسانوں کی نسل سے اٹھنے والوں نے جو کرتوت کئے ان کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا :

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (مریم: ۵۹)

" پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی پیروی کی ، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں ۔"

یہ ہیں وہ "جانشینانِ" ابراہیم و یعقوبؑ ، جنھوں نے مطیع و فرماں بردار یعنی مسلم ہونے کی پہلی نشانی "نماز" کو ضائع کیا ، اس سے غفلت برتی ، ور اس کو چھوڑا ۔ نماز ہی تو وہ چیز ہے جو انسان کو خدا سے جوڑے رکھتی ہے اور خالق و مخلوق کے درمیان جو رابطہ ہے اس کو استوار رکھتی ہے ۔ جب اس رشتہ ہی کو توڑ دیا تو اس کا نتیجہ کیا نکلا ؟ وہ اپنی خواہشات نفسانی کے پیچھے پڑ گئے اور اس سارے قول و قرار سے پھر گئے جو ان کے آباء و اجداد نے اپنے خدا سے کیا تھا ۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اس بدعہدی اور نافرمانی پر وہ یوں ہی چھوڑ دیے جائیں گے ؟ نہیں ، انھیں جلد ہی پتہ لگ جائے گا کہ اس عہد شکنی اور عہد فراموشی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ " انبیاء کی اس اولاد " اور " خدا کی چہیتی قوم " کا کیا حشر ہوا ؟ ہزاروں سال سے جس طرح سے یہ در بدر ماری ماری پھر رہی ہے ، اور ٹھوکریں کھا رہی ہے وہ اب کوئی پوشیدہ راز نہیں ۔

صالحین کے لئے خوشخبری

اس کے برعکس جو لوگ ایمان لائے ، عمل صالح اختیار کیے اور اطاعت و فرمانبرداری کی راہ اختیار کی ، اُن کے لئے خوش خبری ہے کہ :

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـئًا ۝

(مریم : ۶۰)

"البتہ جو توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل اختیار کرلیں، وہ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہوگی ۔"

انبیاء کی دعوت جھٹلانے والوں کا انجام

جن لوگوں نے انبیا علیہم السلام کی ہدایت سے منہ موڑا، انھیں جھٹلایا اور ان کی نافرمانی کی، ان سب کو خواہ وہ کسی نبی سے تعلق رکھتے ہوں، اللہ تعالیٰ نے وہ سزا دی کہ آج بھی ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی سامانِ عبرت ہے۔ فرمایا:

اَلَمۡ يَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ ۙ وَقَوۡمِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاَصۡحٰبِ مَدۡيَنَ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتِ ‌ؕ اَتَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ‌ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظۡلِمَهُمۡ وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ۝

(التوبہ : ۷۰)

"کیا ان لوگوں کو اپنے پیش روؤں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوح کی قوم، عاد، ثمود، ابراہیم کی قوم، مدین کے لوگ اور وہ بستیاں جنھیں الٹ دیا گیا، ان کے رسول اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔"

اور اب بھی جن لوگوں نے حق کو جھٹلایا، انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی اور کئے چلے جا رہے ہیں، وہ سب اُس انجام سے دوچار ہو کر رہیں گے جس سے ایسے ہی لوگ دوچار ہو چکے ہیں:

وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوۡدُ ۙ۝ وَقَوۡمُ اِبۡرٰهِيۡمَ وَقَوۡمُ لُوۡطٍ ۙ۝ وَّاَصۡحٰبُ مَدۡيَنَ‌ ۚ وَكُذِّبَ مُوۡسٰى فَاَمۡلَيۡتُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ‌ ۚ فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ ۝ (الحج : ۴۲-۴۴)

"اے نبی، اگر وہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم

ابراہیم اور قومِ لوط اور اہلِ مدین جھٹلا چکے ہیں۔ ان سب منکرینِ حق کو میں نے
پہلے مہلت دی، پھر پکڑ لیا، اب دیکھ لو کہ میری عقوبت کیسی تھی۔"

مگر کتنے لوگ ہیں جو ان واقعات سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ کیسا ہی رویہ کیوں نہ اختیار کریں، مومنین کو یقین رکھنا چاہیئے کہ ان کا رب زبردست بھی اور رحیم بھی ہے، وہ نہ اپنے فرماں بردار بندوں کو اس حالت میں رہنے دے گا کہ یہ اس کی شانِ رحیمی کے خلاف ہے اور نہ ان کفر وطغیان کے علم برداروں کو کھلا چھوڑ دے گا۔ ایک دن آئے گا کہ ان کی گردنیں ناپی جائیں گی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ
الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ○ (الشعراء: ۱۰۳-۱۰۴)

"یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے
نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔"

۱۵ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ
۲۲ ستمبر ۱۹۷۵ء

آج بھی ہو جو
براہیمؑ
کا ایماں پیدا
اخلاق حسین
اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ ای۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور (پاکستان)